انیسویں صدی کے ریختی گو شعرا: ایک نادر و غیر مطبوعہ ماخذ

نجیبہ عارف*

عبدالغفور نساخ (۱۸۳۴۔۱۸۸۹) کلکتہ سے تعلق رکھنے والے اہم شاعر، تذکرہ نویس، تاریخ گو اور صاحب علم و فضل شخصیت تھے۔علم و ادب سے دلچسپی رکھنے کے ساتھ ساتھ وہ علمِ نجوم، رمل اور جفر کے ماہر تھے۔خوش نویسی بالخصوص خطِ ناخن میں خاصی مشق بہم پہنچائی تھی۔ان کے بھائی نواب عبداللطیف خان بنگال کی اہم ترین شخصیات میں سے ایک سمجھے جاتے تھے۔خود نساخ نے بھی انگریزی تعلیم پائی تھی اور کئی انگریزوں کو فارسی کی تعلیم دی تھی۔متعدد کتب کے مصنف تھے جن میں نظم و نثر دونوں شامل ہیں۔انھوں نے اپنی خودنوشت بھی تصنیف کی تھی جو ان کی وفات کے کم و بیش سو برس بعد کلکتہ سے شائع ہوئی[۱]۔اگرچہ یہ خودنوشت نامکمل ہے لیکن ان کے سوانحی حالات کا مستند ترین ماخذ یہی کتاب ہے۔

ان کے چار دیوان دفترِ بے مثال (۱۸۶۳۔۴)،[۲] اشعارِ نساخ (۱۸۷۴)،[۳] ارمغان (۱۸۷۷)[۴] اور ارمغانی (۱۸۸۶)[۵] کے تاریخی ناموں سے شائع ہوئے۔دیگر شعری مجموعوں میں شاہد عشرت (۱۸۷۴)[۶] فارسی رباعیات کا مجموعہ مرغوبِ دل (۱۸۷۴)،[۷] تاریخ گوئی پر مشتمل قطعات کے مجموعے گنجِ تواریخ (مرتبہ ۱۸۷۳۔۴)،[۸] کنز التواریخ (مرتبہ ۱۸۷۷۔۸)،[۹] باغِ فکر (مطبوعہ ۱۸۸۷)،[۱۰] اردو رباعیات کا مجموعہ ترانۂ خامہ (۱۸۸۴۔۵)[۱۱] شامل ہیں۔ان کے علاوہ معموں کا ایک مجموعہ مظہر معما (۱۸۸۴۔۵)[۱۲] کے عنوان سے شائع ہوا۔کئی ایک نثری رسالے بھی تصنیف کیے جن میں قواعد، عروض، محاورے اور معانی وغیرہ کے مباحث ہیں[۱۳]۔ان مختصر کتابوں میں اہم انتخابِ نقص[۱۴] ہے جس میں انھوں نے انیس اور دبیر کے کلام کے فنی نقائص اور زبان کی غلطیاں دکھائی ہیں۔مولانا شبلی نے موازنۂ انیس و دبیر میں نساخ کے بیشتر اعتراضات کو درست قرار دیا ہے لیکن ان کے جواب بھی دیے ہیں[۱۵]۔اس سے ان کی لسانی مہارت اور عروض و بلاغت پر ان کی دست رس ظاہر ہوتی ہے۔ان تصانیف کے علاوہ انھوں نے اپنی خودنوشت بھی لکھی تھی جو اگرچہ نامکمل رہ گئی اور ان کی زندگی میں شائع نہ ہو سکی لیکن اپنی زندگی کی جزئیات اور اپنے عہد کے دلچسپ مرقعوں سے مزین ہے۔

ان تمام تصانیف کے باوجود ان کی شہرت کا دارومدار ان کی تذکرہ نویسی پر ہے۔ان کی زندگی میں ترتیب پانے

* پروفیسر، شعبۂ اردو، انٹرنیشنل اسلامک یونی ورسٹی، اسلام آباد، مقیم اسلام آباد

والے تذکروں کی تعداد تین ہے۔ ان میں سخن شعرا (۱۸۷۴)،[16] قطعۂ منتخب (۱۸۷۴)[17] اور تذکرۃ المعاصرین (۱۸۹۱) شامل ہیں۔ ان تینوں میں سب سے زیادہ ضخیم اور جامع اردو شعرا کا تذکرہ سخن شعرا ہے جس میں انتالیس شاعرات سمیت تقریباً ڈھائی ہزار شعرا شامل ہیں۔ دوسرے تذکرے قطعۂ منتخب میں ساٹھ ایسے شعرا کو شامل کیا گیا ہے جو قطعات کہتے تھے۔ تیسرا تذکرہ تذکرۃ المعاصرین برصغیر کے فارسی گو شاعروں کے احوال پر مشتمل ہے اور اس میں صرف ''ع'' تک کی ردیف کے شعرا کا حال ملتا ہے۔ یہ تذکرہ نساخ کی وفات کے بعد اسی نامکمل حالت میں شائع ہوا لیکن فارسی گو شعرا کے بارے میں نادر معلومات کا ذریعہ ہے[18]۔ ان تین تذکروں کے علاوہ قند پارسی[19] کے عنوان سے ان کی ایک تذکرہ نما بیاض بھی موجود ہے جس میں فارسی گو شعرا کے کلام کا انتخاب ردیف وار درج کیا گیا ہے۔

راقم الحروف کو کچھ ہی مدت پہلے ان کے تصنیف کردہ ایک اور تذکرے کا قلمی نسخہ دیکھنے کا موقع ملا جس کا مکمل عکس بنا لیا گیا۔ یہ نسخہ بوڈلین لائبریری کے آرکائیوز کے شعبے میں انڈین انسٹی ٹیوٹ کے ذخیرے میں اردو ۲ کے اندراج کے تحت موجود ہے۔ بڑے سائز کے ۹۴ اوراق (۱۸۸ صفحات) پر مشتمل یہ مخطوطہ سرخیوں اور فہرست ابواب کو چھوڑ کر باریک قط کے قلم سے سیاہ روشنائی میں لکھا گیا ہے۔ خط صاف اور عمدہ ہے اور ذرا سی کوشش سے پڑھا جا سکتا ہے۔ پہلے چار صفحات پر موٹے قلم سے فہرست درج ہے۔ فہرست دیکھ کر ہی نساخ کی جدت پسندی کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ یہ تذکرہ لکھنؤ کے استاد شعرا اور ان کے شاگردوں کے بیان پر مشتمل ہے۔ باب ہفتم کے علاوہ پہلے دس ابواب میں اسی ترتیب سے استادی شاگردی کے اعتبار سے تذکرہ مرتب کیا گیا ہے۔ باب ہفتم میں ریختی گو شعرا کا تذکرہ ہے۔ باب یازدہم میں مرثیہ گو شعرا یعنی انیس اور دبیر کا تذکرہ ہے۔ آخری باب یعنی باب دوازدہم میں متفرق اشعار کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ یہ فہرست درج ذیل ہے:

باب اول: استاد مصحفی اور اس کے شاگردوں کے بیان میں
مصحفی۔ انشا۔ خلیق۔ شہیدی۔ ضمیر۔ ظریف۔ عاقل۔ موجی۔ ہوس۔ گرم۔

باب دوم: استاد آتش اور اس کے شاگردوں کے بیان میں
آتش۔ اصغر۔ افضل۔ بسمل۔ خلیل۔ رند۔ سرور۔ شرر۔ شرف۔ منتہی۔

باب سوم: استاد صبا اور اس کے شاگردوں کے بیان میں
صبا۔ ریحان۔ ازل۔ کیف۔ ہنر۔

باب چہارم: استاد ناسخ اور اس کے شاگردوں کے بیان میں
ناسخ۔ آباد۔ آشنا۔ بحر۔ ثاقب۔ رشک۔ آرزو۔ شائق۔ شہید۔ صحبت۔ عرش۔ احقر۔ قبول۔ کیوان۔ مسیحی۔

باب پنجم: استاد برق اور اس کے شاگردوں کے بیان میں
برق۔تسخیر۔احسن۔اشک۔خورشید۔

باب ششم: استاد وزیر اور اس کے شاگردوں کے بیان میں
وزیر۔خلق۔گویا۔محسن۔تقی۔قلق۔ [متن میں خلق کی جگہ قلق کا حال درج ہے]

باب ہفتم: شاعران ریختی گو کے بیان میں
عاشور۔جان صاحب۔خلیل۔اسحاق۔رنگین۔مخلوق۔نسبت۔

باب ہشتم: استاد سرب سنگھ اور اس کے شاگردوں کے بیان میں
سرب سنگھ۔پروانہ۔حسرت۔جرات۔قیس۔حقیقت۔

باب نہم: استاد نوازش اور اس کے شاگردوں کے بیان میں
نوازش۔سرور۔دلگیر۔امانت۔

باب دہم: استاد طوطا رام اور اس کے شاگردوں کے بیان میں
طوطا رام۔زار یعنی میڈو لال۔شوق۔مقبول۔

باب یازدہم: شاعران مرثیہ گو کے بیان میں
دبیر۔انیس۔

باب دوازدہم: شاعران متفرق کے بیان میں
جوش۔آصف۔رحمت۔عباس۔اختر واجد علی شاہ۔ذکی۔مونس۔سوز۔فریاد۔بقا۔اختر وفخر
شاگردان مرزا قتیل۔انور علی۔ادا راک۔فخر۔اشرف۔

فہرست میں کل ۹۱ شعرا کے اسما درج ہیں مگر متن میں چار شعرا کا ذکر موجود نہیں۔ان چار شعرا میں استاد سرب سنگھ اور مونس کے ناموں کی سرخیاں تو درج ہیں مگر کچھ جگہ خالی چھوڑ دی گئی ہے۔شاید مصنف کو اس خالی جگہ کو پر کرنے کا موقع نہ مل سکا۔تیسرا نام خلق کا ہے جس کی جگہ قلق کا حال درج ہے۔چوتھا نام بارھویں باب میں ہے جہاں فہرست میں ''اختر وقمر شاگردانِ مرزا قتیل'' درج ہے مگر متن میں ''اختر شاگرد مرزا قتیل'' کے عنوان سے صرف اختر کا حال دیا گیا ہے۔یوں کل ۸۷ شعرا کا حال اس تذکرے میں ملتا ہے۔

اس تذکرے میں کہیں بھی مصنف کا نام درج ہے، نہ ترقیمہ اور نہ ہی تذکرے کو کوئی عنوان دیا گیا ہے۔راقم الحروف نے اس تذکرے کا عنوان تذکرہ شعرا ے لکھنؤ تجویز کیا ہے۔تاہم مصنف کا تعین متن کی داخلی شہادت سے بآسانی ہو جاتا ہے۔ایک جگہ مصنف نے ایک شاعر اصغر کی وفات کا سال درج کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''راقم نے ان کے انتقال کی

تاریخ لکھی ہے۔'' اس کے بعد اپنا درج ذیل قطعۂ تاریخ درج کیا ہے: جس میں ان کا تخلص نساخ استعمال کیا ہے۔

چوں علی اصغر شد از دنیا سوے ملک عدم
شد دلِ نساخ محزوں را ز بس رنج و الم
شد بہ یک مصرع دو تاریخ ایں چنیں اے جانِ زار
شنبۂ ذی قعدہ ہے، آہ درد و ہائے غم ۱۲۷۶ ہجری

تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ نساخ کا یہ قطعۂ تاریخ ان کی کتاب گنج تواریخ میں شامل ہے[۲۰] جس سے مزید تصدیق ہوگئی کہ دریافت شدہ تذکرہ نساخ ہی کا ہے۔ نساخ کے تذکرے سخن شعرا میں بھی اصغر کے ذیل میں کم و بیش وہی معلومات اور یہی قطعہ شامل ہے۔

اس قیاس کو مزید تقویت اس بات سے ملی کہ مصنف تذکرہ نے جا بجا مختلف شعرا کے احوال میں درج کیا ہے کہ وہ کلکتے آ کر رہے، یا کلکتے میں ہیں۔ اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف کلکتے کا رہنے والا ہے۔

تذکرے کے زمانۂ تصنیف کے بارے میں متنی شہادت اور اس میں درج واقعات و سنین سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تذکرہ ۱۸۷۲ سے ۱۸۸۷ کے درمیان کے زمانے میں لکھا گیا۔ یہ اندازہ یوں ہوتا ہے کہ اس نسخے میں کئی جگہ ایک کتاب مجموعۂ سخن[۲۱] کا تذکرہ ہے۔ مجموعۂ سخن ۱۸۷۲ میں پہلی بار شائع ہوئی تھی۔ تذکرے کے آخری باب میں بیان کیا گیا ہے کہ واجد علی شاہ ان دنوں کلکتے میں مقیم ہیں۔ واجد علی شاہ کا انتقال ۱۸۸۷ میں ہوا۔ گویا یہ تذکرہ ۱۸۷۲ کے بعد اور ۱۸۸۷ء سے قبل لکھا گیا تھا۔

اس تذکرے کی اہمیت اس بات میں ہے کہ نہ صرف ہر شاعر کا مفصل حال بلکہ اس کے عہد کا تفصیلی بیان بھی ملتا ہے۔ یہ تذکرہ انیسویں صدی کے نصف اول کے لکھنؤ کی علمی و ادبی فضا اور سماجی و معاشرتی ماحول کا نادر مرقع ہے۔ شعرا کی معاصرانہ چشمک، ان کی زندگی کے غیر ادبی مشاغل، کھیل، تہوار اور تہور کے مظاہر جا بجا دکھائی دیتے ہیں۔ ہر شاعر کے احوال کے ذیل میں خاصی معلومات درج ہیں مگر بعض اوقات یہ معلومات مذکورہ شاعر کے بجائے اس کے اجداد یا معاصر سیاسی حالات کے مرقعوں پر مشتمل ہیں۔ دیگر تذکروں کے برعکس کل شعرا میں سے نصف کے قریب شعرا کا نمونۂ کلام دیا گیا ہے۔ نمونۂ کلام دیتے ہوئے نساخ نے زیادہ احتیاط کا مظاہرہ نہیں کیا۔ اسی طرح بعض سیاسی وقائع کے بیان میں بھی سنی سنائی پر انحصار کیا ہے۔ تاہم دلچسپ بات یہ ہے کہ نساخ نے روزمرہ کے رواں دواں انداز میں لکھنوی معاشرت کے متنوع پہلو پیش کر دیے ہیں اور معاصر شہادت ہونے کی بنا پر انھیں اہمیت دی جا سکتی ہے۔

ذیل میں اس تذکرے کے باب ہفتم کا متن پیش کیا جا رہا ہے۔ اس باب میں نساخ نے سات ریختی گو شعرا کا حال بیان کیا ہے۔ بیشتر شعرا کے بیان میں ان کے آبا و اجداد یا اس عہد کے سیاسی حالات و واقعات کا ذکر غالب ہے اور کسی ایک

شاعر کا بھی نمونۂ کلام درج نہیں ہے۔ بیشتر شعرا نواب عاشور علی خان کے شاگرد ہیں۔ اس سلسلے میں ایک عجیب بات انھوں نے یہ لکھی ہے کہ عاشور کے دو شاگرد چرکین اور جان صاحب دراصل مشاعروں میں اپنے استاد ہی کا کلام پڑھتے تھے اور ان کی شہرت کی اصل وجہ یہ ہے کہ ان کا ریختی پڑھنے کا انداز نہایت پر اثر اور مقبول عام تھا۔ جان صاحب کے بارے میں تو واضح طور پر لکھا ہے کہ وہ خود فن و رموزِ شاعری سے ناواقف تھے اور ایک موقع پر جب ان کی آزمائش کی گئی تو وہ درست شعر کہنے سے معذور رہے۔ اس کے بعد انھوں نے مشاعروں میں کلام پیش کرنا چھوڑ دیا۔ یہ ایک ایسی بات ہے جس کا ذکر سوائے زیرِ نظر تذکرے کے کہیں نہیں ملتا۔ آخر میں نساخ نے خود ہی یہ بھی لکھ دیا ہے کہ جان صاحب کے دو دیوان طبع ہوئے ہیں جن میں سے پہلا ان کے استاد عاشور کا تصنیف کردہ ہے اور دوسرا خود ان کی تصنیف ہے۔ ان کے بیان کے تضاد ان کی اس بات کو مشکوک بننے کو کافی ہے۔ دوسری بات یہ کہ چرکین کا ذکر عاشور کے تذکرے میں ان کے چہیتے شاگرد کے طور پر موجود ہے مگر انھیں اس باب میں بطور شاعر شامل نہیں کیا گیا۔ اسی طرح نواب شرف الدولہ خلیل کو ریختی گو شاعر کے طور پر شامل کیا گیا ہے لیکن ان کی شاعری یا ریختی گوئی کے بارے میں خاطر خواہ معلومات نہیں ملتیں۔ ان کے نام کے تحت بادشاہانِ اودھ کی تخت نشینی کے واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ ان میں سے کچھ واقعات کی تصدیق تو تاریخ کی دیگر کتب سے ہو جاتی ہے مگر کچھ واقعات ایسے بھی ہیں جو غالباً افواہوں پر مشتمل ہیں۔

بابِ ہفتم کا متن رائج املا میں پیش کیا جا رہا ہے۔ جو الفاظ پڑھے نہیں جا سکے یا جن کے املا کے بارے میں شبہ تھا، ان کے سامنے خطوطِ وحدانی میں]؟[یا] کذا[کی علامت لگائی گئی ہے۔ غلط املا یا حذف شدہ الفاظ کی صورت میں خطوط وحدانی میں مذکورہ لفظ لکھ دیا گیا۔ جہاں ضرورت محسوس ہوئی وہاں حواشی کا اضافہ کیا گیا ہے۔

[نوٹ: تذکرے کا مکمل متن مع حواشی و تعلیقات زیرِ ترتیب ہے۔]

بابِ ہفتم
شاعرانِ ریختی گو کے بیان میں

عاشور

تخلص عاشور، نواب عاشور علی خان بہادر مرحوم ولد نواب محمد علی خان بہادر، دادا ان کے نواب شجاع الدولہ بہادر مرحوم ہیں۔ اصل وطن ان کا خاص دہلی ہے اور صوبہ دار تھے۔ یہ بہادر اور جری نہایت تھے۔ ایک دن بادشاہ[۲۲] نے اپنے دل میں سوچا کہ اگر یہ شخص بدی پر آ جائے اور آپ تخت پر بیٹھ جائے، تو کوئی تدبیر نہ کام آئے گی۔ اپنے وزیروں سے] کہا[کہ کوئی ایسی صورت نکالو کہ شجاع الدولہ مارڈالا جائے یا آپ یہ خود مر جائے۔ ان لوگوں نے ہاتھ جوڑ کر بادشاہ سے عرض کیا کہ حضور ایسے بہادر کو کون مار سکتا ہے، وہ خود بھی پہلوان ہے اگر دس پانچ آدمی پر وہ گر پڑے تو کچل جائیں۔ ان کی طاقت

کا حال آپ کو معلوم ہے یا نہیں ہے۔ پانچ سیر کا خود سر پر رکھتے ہیں اور چار سیر کے دستانے ہاتھوں میں چڑھے رہتے ہیں ودس سیر کی زرہ پہنتے ہیں و آٹھ سیر کا چلتا [چلتہ] بر میں، بارہ سیر کی زنجیر کمر میں بجائے پٹکے کے رہتی ہے، پانچ سیر کا چھرُا کمر میں رہتا ہے اور پندرہ سیر کا نیفا] نیفہ] باندھتے ہیں، نو سیر کی سپر پشت پر ہر وقت لگی رہتی ہے۔ سات سیر کا نیزہ اس خوبصورتی کے ساتھ ہلایا کرتے ہیں کہ جس طرح سے پہلوان ہلکی جوڑی واسطے تیاری کے ہلاتے ہیں۔ [۲۳] مگر ہاں حضور ایک یہ شکل ہے کہ جس وقت کہیں لڑائی درپیش ہو تو نواب شجاع الدولہ بہادر کو بھیج دو اور فوج کو یہ حکم ہو کہ جس دم دشمن کے لوگ سے مقابلہ ہو، آپ کے لوگ فرار ہو جائیں۔ نواب شجاع الدولہ تنہا کب تک لڑیں گے۔ آخر کو مار ڈالے جائیں گے۔ بادشاہ نے یہ تدبیر اس مشیر کی نہایت پسند کی۔ تھوڑے عرصہ کے بعد مرہٹوں سے لڑائی درپیش ہوئی۔ بادشاہ کا نواب شجاع الدولہ کو حکم ہوا کہ جلد جا کر اس لڑائی کو فتح کرو۔ بادشاہ نے افسران فوج کو بالا بالا سمجھا دیا کہ جس وقت لڑائی ہو تم کنارہ کر جانا۔ یہ بادشاہ سے رخصت ہو کر دشمن کی فوج کی طرف چلے۔ اچھی طرح مقابلہ بھی نہیں ہوا تھا کہ بادشاہ کی فوج بھاگنے لگی۔ نواب شجاع الدولہ نے گولہ اندازوں کو حکم دیا کہ فتح نامہ کی توپیں فیر کرو۔ ادھر توپ پر بتّی پڑی، ادھر فوج یہ سمجھی اگر نہیں پھرتے ہو تو تمام عمر نواب شجاع الدولہ بہادر سے آنکھ نہ چار ہو گی۔ یہ سوچ کے فوج سلطانی پھری۔ مارے خوف کے دشمن کی فوج کے پاؤں اٹھ گئے اور خدا کی عنایت سے لڑائی سر ہو گئی۔ نواب شجاع الدولہ نے سر اس بخیل کا کاٹ کے حضوری میں بادشاہ کی روانہ ہوئے۔ چند عرصے کے بعد بادشاہ کی خدمت میں داخل ہوئے۔ بادشاہ نے جو دیکھا کہ نواب مذکور خون میں ڈوبے ہوئے چلے آتے ہیں، بادشاہ تو محل میں داخل ہو گئے، دوسرے وزیر کو حکم دیا کہ نواب شجاع الدولہ سے کہو کہ جب تک بادشاہ تم کو یاد نہ فرمائیں، دربار شاہی میں نہ آنا۔ یہ حکم سن کے نواب شجاع الدولہ کو نہایت رنج ہوا، دل سے کہا کہ بادشاہ ناقدر ہے۔ نواب صاحب اپنے مکان میں بیٹھ رہے۔ [۲۴]

تھوڑے عرصہ کے بعد بادشاہ نے۔۔۔] ؟[کے علاقے کا حکم دیا کہ تم وہاں جاؤ۔ نواب نے کہا کہ بہت خوب۔ جس دن دہلی سے چلے تھے، ہزار ہا آدمی ان کے ساتھ تھا، کئی برس کے زمانہ میں ملک کو فتح کیا، بادشاہ کو ایک۔۔۔] ؟[نہیں بھیجا۔ فیض آباد میں سکونت اختیار کی، وہاں رہنے لگے۔ جب نواب کو حافظ رحمت خان کی دختر نے نشتر زہر آلود نواب کی بائیں ران میں مارا، نواب نے اسی وقت اس کی ٹانگیں پھاڑ ڈالیں۔ بعد دو روز کے انتقال کیا۔ [۲۵]

نواب آصف الدولہ جب تخت نشین ہوئے، جب] تب] نواب لکھنؤ میں آئے۔ نواب عاشور علی خان محلہ مالی خان کی سرائے میں مقیم ہوئے۔ نہایت ایک مکان عمدہ تیار کیا۔ رفقا ان کے نہایت ذی علم تھے۔ یہ ہم عصر میاں مصحفی، میر محمد تقی، سودا کے تھے، طبیعت بہت شوخ تھی ان کی۔ مشاعروں میں جایا کرتے تھے مگر آپ اس خیال سے غزل مشاعرے میں نہیں پڑھتے تھے کہ شاگرد یہ کسی کے نہ تھے۔ اور شعر بہت خوب فرماتے تھے۔ اب شہر کے لوگ ان کے شاگرد ہونے لگے۔ طرح] کی [غزل ان کی نہایت دل لگا کے نواب صاحب بنانے لگے۔ جب دس، بیس آدمی ان کے شاگرد ہوئے تو اس وقت ان کو

اپنے ساتھ لے کے نواب مذکور مشاعرے میں تشریف لے گئے۔ جب ان کے شاگردوں نے طرح کی غزل مشاعرے میں پڑھی تو شعرائے لکھنؤ نے ان سے پوچھا کہ تم کس کے شاگرد ہو؟ ان لوگوں نے عرض کیا کہ نواب عاشور علی خان کے ہیں۔ یہ سن کے صاحب مشاعرہ نے طرح کا مصرع ان کی خدمت میں بھیجا۔ اس کے جواب میں انھوں نے یہ لکھا کہ میں شعر نہیں کہتا ہوں، ہاں جو میرے دوست ہیں، ان کی از راہ دوستانہ غزل بنا دیتا ہوں۔ ہزار ہا طرح سے لوگوں نے چاہا کہ نواب صاحب سے مشاعرے میں غزل پڑھواویں مگر ایک مصرع زبان سے نواب مرحوم نے کسی شخص کے سامنے نہیں پڑھا اور نہ کہیں اپنی زبان مبارک سے یہ فرمایا کہ شعر ہم کہتے ہیں[۲۶]۔ بہت سی غزل] کذا[۔ ان کے شاگرد صاحب دیوان ہیں مگر دو شاگرد ان کے ایسے نامی ہوئے کہ ان کے باعث سے نواب کا ہر ملک میں نام ہو گیا اور شاعری مشہور ہو گئی، ایک تو میاں چرکین مرحوم[۲۷] دوسرے جان صاحب ریختی گو۔ یہ دونوں صاحب دیوان ہیں۔ نواب کی قدردانی کا ایک ادنیٰ سا حال یہ ہے کہ چرکین، شیخ باقر علی، باشندہ قصبہ ردولی ان کے ملازم تھے دس روپیا ماہواری کے اور دستر خوان پر دونوں وقت کھانا کھاتے تھے اور جس قدر امیر لکھنؤ میں تھے ان سے کچھ تنخواہ بھی مقرر کروادی تھی۔ یہ حسن مشاعرہ تھے۔ جو شخص مشاعرہ اپنے مکان میں کرتا تھا وہ ان کو بھی ضرور بلاتا تھا اور بعد کل شعراؤں] شعرا[کے یہ مشاعرے میں طرح کی غزل پڑھتے تھے۔ جب میاں چرکین نے عارضۂ پیچش میں انتقال ہوا تو وہ لطف اب مشاعروں میں نہ رہا اور جس قدر جمع] مجمع[ہوتا تھا ان کے سننے والوں کا، وہ موقوف ہو گیا۔ شعراؤں] شعرا[نے نواب صاحب سے کہا کہ کوئی نسخہ ایسا اور نکالیے۔ اس وقت نواب نے جان صاحب کو نکالا۔ جس دن یہ مشاعرے میں پڑھتے تھے، لوگ ان کو سن کے چرکین کو بھول گئے اور نواب کی طبیعت داری کی نہایت تعریف کی۔ جان صاحب بھی ان کے ملازم تھے۔ اکثر لوگوں سے سنا کہ دس روپیا کی ماہواری ان کی بھی مقرر تھی مگر یہ بات تو تمام شہر میں ظاہر ہے کہ ہر ایک امیر کی سرکار سے تنخواہ ان کو کچھ ملتی تھی اور جو شخص مشاعرہ کرتا تھا وہ بھی کچھ ان کی خدمت کرتا تھا۔ غرض یہ دونوں آدمی اپنے کام میں بے مثل تھے۔

۔۔۔۔فقط۔۔۔۔

جان صاحب

تخلص جان صاحب میر یار علی، پیشہ لوہاری و نجاری کرتے ہیں[۲۸]۔ ولد میر امن، شاگرد نواب عاشور علی خان بہادر، پوتے نواب شجاع الدولہ بہادر مرحوم، سکونت لکھنؤ محلہ سرائے مالی خان، متصل مکان نواب شرف الدولہ بہادر مرحوم۔ ابتدائی عمر میں ان کو شوق ڈھول پر شعر پڑھنے کا ہوا تھا۔۔۔] ؟[ساکن مفتی گنج، کالکا کے پل پر یہ لوگ شام سے تا دو پہر رات تک ڈھول پر شعر پڑھا کرتے تھے۔ جان صاحب بھی اس صحبت میں جا کر شعر ان لوگوں کے ساتھ پڑھتے تھے، میر امن سے پوشیدہ ہو کر اور وضع بھی یہی تھی۔ نواب عاشور علی خان کے مکان کے قریب ان کا بھی مکان تھا۔ نواب صاحب نے ان سے کہا کہ دکان داری میں تم کو کیا حاصل ہوتا ہے۔ اگر ریختی پڑھا کرو تو تم کو بہت سا کچھ حاصل ہوا کرے گا اور شہر میں جس

قدر امیر ہیں وہ سب تمہاری خاطر کریں گے۔ ڈھول پر تم شعر پڑھتے ہو، یہ کام نہایت برا ہے اور کچھ حاصل بھی تم کو نہیں ہوتا ہے۔ جان صاحب نے نواب صاحب سے یہ کلمہ عرض کیا کہ شعر کہنا نہیں جانتا ہوں کیوں کر میں اس کام کو اختیار کروں؟ نواب نے فرمایا کہ ریختی میں تم کو کہہ دیا کروں گا مگر پڑھنا تم کو پڑھے گا اور چند روز میں شعر بھی تم کو آ جائے گا اور میں بھی تمہارے ساتھ کچھ سلوک کیا کروں گا۔ وہ زمانہ نصیر الدین حیدر بادشاہ کا تھا۔ ابتدا ان کی ریختی پڑھنے کی یہ تھی کہ تجمل حسین خان کی بارہ دری میں مشاعرہ ہوتا تھا، وہاں جان صاحب نے اول ریختی مشاعرے میں پڑھی تھی۔ نہایت لوگوں نے ان کی تعریف کی اور ہر ایک شخص کو ان کے سننے کا اشتیاق ہوا۔ امیروں نے تو اپنے مکان پر بلا کر سنا اور غریب لوگ جہاں مشاعرہ ہوتا تھا وہاں ان کو سننے کو جایا کرتے تھے۔ کسی سرکار سے دوشالہ عنایت ہوا، کسی سرکار سے نقد روپیا مرحمت ہوا۔ اب دماغ میر علی کا آسمان پر ہو گیا۔ ہر ایک شخص سے سیدھی بات نہ کرتے تھے۔ بڑے بھائی ان کے نہایت ناراض تھے کہ روز کہتے تھے یہ کام عورتوں کا تو نے مرد ہو کر اختیار کیا اور شرم حیا کو آنکھ سے بالکل اٹھا دیا، اب یہی بہتر ہے کہ اس کام کو ترک کرو مگر ان کو دس بیس روپیہ]روپیا] روز اس کام میں حاصل ہونے لگا، یہ کب ترک کرتے ہیں۔ ملازم یہ نواب حسام الدولہ بہادر، واجد علی بادشاہ کے نسبتی بھائی کے ہوئے۔ بیس روپیا ماہواری کے اور ہر روز انعام ملتا تھا۔ نواب عاشور علی خان مرحوم نے جس قدر نواب زادے شہر لکھنؤ میں تھے، اور اپنے عزیز داروں سے اور شاگردوں سے جو کہ امیر تھے اور ہر اہل مشاعرہ سے فی مشاعرہ دو روپیا مقرر کروا دیا۔ جب جان صاحب کو سو، پچاس روپیا کی ماہواری اہل شہر سے حاصل ہونے لگی، مثل مشہور ہے کہ جس قدر آمدنی ہوتی ہے، اس قدر خرچ بشر کا بڑھ جاتا ہے۔ جان صاحب نے ایک گھوڑا خرید کیا واسطے سواری کے اور چار نکاح کیے۔ اِس بی بی سے ناراض ہوئے تو اُس بی بی کے گھر میں جا کر رہے۔ ہر روز ان کو عید تھی اور ہر رات شبرات]شب برات] تھی مگر اکثر اہل شہر کی زبانی یہ بات سنی ہے کہ جان صاحب شعر خود نہ کہتے تھے، نواب ان کو تصنیف کر دیتے تھے[۲۹]۔ ہاں ریختی پڑھتے خوب تھے، مگر جان صاحب پر موقوف نہیں ہے۔ نواب صاحب کے اکثر ایسے شاگرد بہت سے تھے۔ ان کو خود تصنیف کر دیتے تھے۔ ان کا دیوان چند عرصے میں نواب صاحب نے تیار کر کے چھپوا دیا۔ اس سبب سے ہر شہر میں ان کا نام ہو گیا۔ واجد علی بادشاہ جب تخت نشین ہوئے تو مشاعرہ صحبت خاص و عام کا کیا۔ مصرع طرح یہ ہے

دھوکے کی ٹٹی رکھتے ہیں دام کشان سبز رنگ

اس مشاعرے میں جان صاحب بھی تشریف لے گئے تھے۔ جب ان کا ریختی پڑھنے کا زمانہ آیا تو جان صاحب نے پیش خوانی میں یہ شہر آشوب کو پڑھا، اس کا مصرع یہ ہے اور اسی مصرعے پر عتاب شاہی ہوا کہ ہاتھ اور ناک کاٹ کے اس کو تمام شہر میں پھراؤ مگر فتح الدولہ بہادر نے بادشاہ کی خدمت میں ہاتھ جوڑ کے عرض کیا کہ حضور اس کا یہ شہر آشوب بہت عرصہ ہوا ہے۔ اس خانہ زاد نے نواب حسین علی خان ہم عصر کے مشاعرہ میں سنا ہے۔ کسی شخص کی کیا مجال ہے کہ آپ کی یا آپ

کے شہر کی ہجو کوئی لکھے۔اس کلمہ پر تا دیر بادشاہ نے جان صاحب کی خطا معاف فرمائی اور حکم کیا اس کو اسی وقت مشاعرے سے نکال دو۔خدا خدا کر کے یہ اپنے گھر میں آئے،اس شہر آشوب کا مصرع یہ ہے:

گور پر روتی ہے حاتم کی سخاوت آج کل [۳۰]

جب واجد علی بادشاہ سے ملک نکل گیا تو جان صاحب کی تنخواہ ہر امیر نے اپنی سرکار سے موقوف کر دی۔ چند امیروں کی سرکار سے تنخواہ جاری رہی۔اس قلیل تنخواہ نے جان صاحب کی آبرو بگاڑ دی کہ تن پر ایک کپڑا باقی نہ رہا،روٹی ہزار خرابی سے میسر شام تک آتی تھی۔ چند دن اس صورت سے اوقات بسر کیے۔ بعد اس کے غدر ہو گیا۔جب سرکار کی عمل داری دوبارہ ہوئی تب زمانہ منشی فرمان علی کا ہوا اور منشی درت سنگھ کا ہوا۔منشی رام پرشاد دیوان نواب محسن الدولہ بہادر کا دخل حسین آباد میں ہوا۔جان صاحب ان امیروں کا دربار کرنے لگے۔ چند عرصے کے بعد درخواست کی کہ دخترِ ناکتخدا کی شادی ہے اور کہیں مجھ کو کلیچہ کا سہارا نہیں ہے۔امیدوار ہوں کہ آپ لوگوں سے کہ اس بے کس کی دستگیری کیجیے تو اس کے بار سے نجات پاؤں۔ان سب امیروں نے تدبیر کر کے کچھ روپیا بطور چندہ کے کر کے جان صاحب کو عنایت فرمایا۔جان صاحب نے ایک مردی] ؟] آدمی کا لڑکا تھا،کامدانی کا کام بناتا تھا،اس کے ساتھ نکاح کر دیا۔

بابو ہفت ہزاری،تخلص جوان قوم برہمن ساکن بنارس تھے۔وہ مدرس اسکول امین آباد میں [۳۱] مقرر ہوئے واسطے تعلیم طفلاں کے۔منشی اسیر کے شاگرد ہوئے۔مشاعرہ نواب آغا علی خان مرحوم کے امام باڑے میں ہر ماہ کی پندرہ تاریخ کو مشاعرہ شروع کیا] کذا[۔بابو ہفت ہزاری نے جان صاحب کو بھی بلایا اور عصمت کو بھی بلایا۔اِن کی اور اُن کی سب خفاف پر گفتگو ہونے لگی۔جس قدر لکھنؤ میں استاد تھے،اس وقت سب موجود تھے۔منشی مظفر علی اسیر،میاں بحر،عصمت نے جان صاحب سے کہا کہ تم پچاس برس کے شاعر ہو کر اور تم کو ابھی تک قافیہ اور ردیف میں دخل نہیں ہے۔وہ سب خفاف یہ ہیں:

جس پہ بیتی ہو یہ وہی جانے
جو کہ بے درد ہو وہ کیا جانے
جب میں سسرال کو لگی جانے
دونوں بہنوں نے اور مری ماں نے
میرے چھٹنے کا جب خیال کیا
کیا کہوں کیسا اپنا حال کیا

سب خاص و عام نے سن کے یہ کہا کہ دراصل اس میں قافیہ نہیں ہے۔جان صاحب تمہاری غلط فہمی ہے،حقیقت ہے کہ جو لوگ کہتے تھے کہ نواب عاشور علی خان جان صاحب تم کو شعر کہہ دیتے ہیں،اس بات کا آج امتحان ہوا اور عصمت کا] کہنا؟[بے جا نہیں ہے کہ ابھی تم طفل مکتب ہو۔یہ سن کے جان صاحب نے جواب دیا کہ میں غلط،میرا کلام بھی غلط اور

طفل مکتب سے بھی بدتر ہے اور تم لوگ سچ کہتے ہو۔ یہ کہہ کر سر مشاعرہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس دن سے بھی تا آج تک] کذا] عصمت کے مقابلہ پر جان صاحب نہیں آئے [۳۲]۔ جہاں مشاعرہ ہوتا تھا، ایک صحبت میں جان صاحب پڑھتے تھے اور ایک صحبت میں عصمت۔ اس عرصے میں نواب حیدر علی خان برادر نواب والی رام پور لکھنؤ میں تشریف لائے اور مقیم الماس علی خان کے امام باڑے میں ہوئے۔ عصمت اور جان صاحب کو بلوایا۔ ایک جلسے میں عصمت کو سنا اور ایک جلسے میں جان صاحب کو اور فرمایا کہ تم دونوں آدمی اگر رام پور چلو تو ہم اپنے ہمراہ تم کو لے چلیں۔ شاعر تو ہمارے شہر میں ہوتے ہیں اور لکھنؤ کے بہت آدمی ہیں مگر ریختی کوئی نہیں ہے۔ بیس روپیا کی تنخواہ تم دونوں صاحبوں کو سرکار رام پور سے ملے گی۔ یہ سن کے عصمت نے عرض کیا کہ حضور ہزار زمانہ پریشان ہو گیا ہے، اب بھی ہم کو خدا کی عنایت سے پچاس روپیا کی ماہواری حاصل ہوتی ہے۔ ہاں جان صاحب کا جی چاہے تو آپ کے ساتھ چلے جائیں مگر میں نہیں جا سکتا ہوں، جب تلک پچاس روپیا کی سرکار سے تنخواہ نہ مقرر ہوگی۔ نواب صاحب رام پور کو تشریف لے گئے۔ جان صاحب کو بلوا بھیجا۔ وہ مع اپنے اہل خانہ کے تشریف رام پور کو لے گئے۔ آج تک وہاں ہیں اور بیس روپیا کے نواب صاحب کے ملازم ہیں اور ایک دختر اپنی کی شادی خان صاحب کے چوب دار کے ساتھ کر دی اور بڑے داماد کو کامدانی کی دکان کرا دی ہے۔ اس میں اوقات اپنی بسر کرتے ہیں اور چند دن کے واسطے لکھنؤ میں میر محلہ بھی ہو گئے تھے۔ جب سے گئے ہیں رام پور لکھنؤ میں نہیں آئے۔ ان کی یادگار میں سے یہ کلام موجود ہے، ایک دیوان اول کا جو ہے، وہ تو نواب صاحب کا تصنیف ہے، دوسرا دیوان خان صاحب کا تصنیف ہے، وہ نہایت فحش ہے۔ بیگمات کی زبان نہایت پاکیزہ ہوتی ہے، فصاحت سے خالی نہیں ہے۔

۔۔۔۔فقط۔۔۔۔

خلیل

تخلص خلیل، حافظ محمد ابراہیم خان مرحوم، قوم کشمیری، خطاب نواب شرف الدولہ بہادر ولد خواجہ عبدالحکیم، شاگرد نواب عاشور علی خان مرحوم۔ بہادری کا خطاب نواب قاسم علی خان کی سرکار سے عنایت ہوا۔ سکونت ان کی کشمیر ہے اور مسکن لکھنؤ محلہ مالی خان کی سرائے متصل مکان میر علی صاحب مرحوم، مرثیہ خواں نامی و گرامی، چچا ان کے مولوی منشی غلام یحییٰ، میر منشی ریزیڈنٹ بہادر کے تھے، عرف بڑے صاحب بہادر۔ جب بادشاہ نصیر الدین حیدر بہادر نے ۱۲۵۵ ہجری [۳۳] میں انتقال کیا دن کو تین بجے۔ شب کے نو بجے بادشاہ مرحوم کی والدہ نواب بادشاہ بیگم صاحبہ کو خبر ہوئی کہ نصیر الدین حیدر بادشاہ راہی خلد ہوئے، بیگم صاحبہ نے اپنی فوج آراستہ کر کے نواب منا جان بہادر کو اپنے ہمراہ لے کر الماس باغ سے طرف لکھنؤ کے قصد کیا۔ تھوڑے عرصے میں قریب بیلی گارد کے آ پہنچیں۔ انگریزی کمپنی نے اور ریزیڈنٹ بہادر نے ہر چند کہا کہ بارگاہ سلطانی میں ابھی جانے کا قصد نہ کرو، صبح کو ہم خود بلا لیں گے۔ اگر کہنا ہمارا آپ نہ مانو گی تو تمہارے حق میں یہ بات بہتر نہ ہوگی۔ بیگم صاحبہ نے ہرگز کہنا صاحب بہادر کا نہ مانا۔ کپتان صاحب داروغہ خزانہ کے بازار میں آ کر دروازہ

ہاتھی سے تڑواڈالا اور نواب مناجان کو تخت کے اوپر بٹھادیا۔ ان کا ایک داروغہ امام بخش بہشتی تھا، بے علم آدمی، اس نے نواب بیگم صاحبہ سے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا کہ حضور نواب روشن الدولہ بہادر کے مکان پر اور منشی سبحان علی خان کمبو، دنیا مہری [۳۴] خطاب افضل النسا خانم، ان سب کے مکان پر سرکاری پہرے کا حکم دیجیے تو خانہ زاد مقرر کردے، تا مال اور اسباب کہیں اور جگہ نہ نکل جائے اور نواب صاحب جب نذر دینے کو آئے، اس وقت قید کرلوں گا۔ جناب بیگم صاحبہ نے حکم دیا کہ بہتر ہے۔ دو گھڑی رات باقی تھی۔ اس وقت داروغہ صاحب نے سب کے مکان پر پہرہ مقرر کردیا۔ اس وجہ سے نصف فوج نواب مناجان میاں صاحب بہادر کی رہ گئی تھی۔ صبح ہوئی۔ یہ سب صاحب نذر دینے کے واسطے حاضر ہوئے اور فوج بادشاہی بھی حاضر تھی اور انگریزی بھی موجود تھی۔ مناجان بہادر نے نواب صاحب [۳۵] کا شملہ اچھال دیا اور فرمایا کہ اس کو بانسوں سے مارو۔ یہ حکم سن کے نواب صاحب نے جا کر سب حال بڑے صاحب بہادر سے عرض کیا کہ ابھی سے اس کا یہ حال ہے، آگے خدا جانے کیا ظلم کرے گا۔ اس کا تخت پر بیٹھنا اچھا نہیں ہے۔ آگے حضور کو اختیار ہے۔ یہ سن کے ریزیڈنٹ بہادر اور چھوٹے صاحب بہادر [۳۶] نے نہایت سمجھایا مگر مناجان بہادر نے نہ منظور کیا بلکہ اس قدر تکرار ہوئی کہ چھوٹے صاحب کے ابرو نواب مناجان کی تلوار کے قبضے سے پھوٹ گئے اور خون جاری ہوا۔ یہ حال دیکھ کے بڑے صاحب نے میگنس صاحب سے فرمایا کہ تم کس کے ملازم ہو؟ وہ بولے، بادشاہ کے۔ پھر صاحب بہادر نے کہا کہ حکم کس کا؟ کہا، آپ کا۔ حکم دیا کہ انہیں مارے توپوں کے اڑادو۔ یہ سن کے اس نے توپ میں جنگی گولہ دیا اور گولہ اندازوں کو حکم فیر کا فرمایا، غرض توپ چلنے لگی۔ دو گھڑی میں صدہا آدمی مارا گیا۔ نواب مناجان کو اور نواب بادشاہ بیگم کو قید کر کے بیلی گارد میں لے گئے۔ لاشوں کا اٹھانے کا حکم دیا اور صاحب بہادر نے مولوی منشی غلام یحییٰ سے پوچھا کہ نواب سعادت علی خان مرحوم کی جو بڑی بیٹی ہیں، وہ نواب صاحب مرحوم کے زمانہ میں کام نیابت کا بھی کر چکی ہیں، یہ کاغذ ان کو دکھلانا کہ سلطنت آپ کو مبارک ہو۔ مولوی صاحب مرحوم وہ کاغذ لے کر محمد علی بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ جو حضور کو لکھنؤ کی سلطنت حاصل ہو تو ہم کو کیا عنایت فرمائیں گے؟ محمد علی شاہ نے ارشاد فرمایا کہ اگر ہم کو سلطنت حاصل ہوگئی تو تم کو ہم اپنا نائب کریں گے۔ منشی صاحب نے عرض کیا کہ حضور اس دفتر پر دستخط فرمائیں تو حکم میں آپ کی منظوری کا دکھلادوں، بادشاہ نے اس وقت قلم اٹھا کر دستخط کردیا۔ مولوی صاحب نے وہ کاغذ ملاحظہ میں گذرا دیے۔ محمد علی بادشاہ کو سوار کرا کے بارگاہ سلطانی میں داخل کیا۔ بڑے صاحب نے اور چھوٹے صاحب نے ان کا ہاتھ پکڑ کے تخت بادشاہی پر بٹھادیا اور ہر سمت سے نذریں گذرنے لگیں اور طوائف بھی اپنا اپنا رقص کرنے لگیں [۳۷]۔ بادشاہ نے آغا میرزا کا کو نصیر الدین حیدر کا جوتھا، دوڑ سرکاری بھیج کر سب مال و اسباب اسی وقت اٹھوالیا۔ نواب روشن الدولہ کو اور سبحان علی خان کمبو کو اور دنیا مہری کو نظر بند کیا۔ مولوی غلام یحییٰ کو خلعت وزارت کا عنایت فرمایا اور نقد بہت سا روپیا۔ مال دنیا سے غنی کردیا۔ وہ عمدہ مکان بنائے کہ خواب میں نظر نہ آتے تھے۔ جس قدر ان کے دوست اور آشنا تھے، سب ملازم سرکار کردیا اور مکان بنوادیے اور ان کے

لڑکوں کی شادی کرادی، ان کے عزیزوں کے ساتھ ہر طرح کا سلوک کیا۔ اپنے عزیز جس قدر تھے، سب کو نوکر رکھوا دیا اور نقد روپیا اپنے پاس سے دیا اور مکان عمدہ خرید دیے۔ صدہا آدمی امیر و غریب کے ساتھ سلوک کیا۔ جو کوئی لاوارث مر جاتا تھا، اس کو ان کی سرکار سے کفن اور خرچ ملتا تھا اور جو کوئی شخص واسطے حج کے جاتا تھا، سو روپیا یہ دیتے تھے، کسی شخص کی بیٹی واسطے شادی کے بیٹھی ہے اور اس کے باپ اور ماں کے پاس کچھ نہیں ہے، جس وقت ان کو اس شخص نے عرضی دی، اسی وقت اس کو شادی کے واسطے روپیا ملتا تھا۔ تمام اہل محلہ ان سے نہایت خوش تھا۔ کسی کو ان کی ذات سے تکلیف نہیں ہوئی۔۔۔] ؟[فیض ان کا سن کے، لاکھ روپیا اس دن مرحمت فرمایا۔ خدا کی قدرت کا کارخانہ دیکھیے کہ ایک دم میں امیر ہو گئے۔ چند عرصہ کام وزارت کا ساتھ نیک انجام کے کیا، بعد اس کے عارضہ سردرد میں انتقال کیا۔

ان کی جاے پر بادشاہ نے محمد ابراہیم مخاطب نواب شرف الدولہ بہادر کو وزیر کیا[۳۸]۔ صوبہ اودھ کا ایسا انتظام کیا کہ کسی وزیر سے ان کے مقابلے میں نہ ہو سکا۔ کل خرچ بادشاہ کو دے کے، چار کروڑ روپیا خزانے میں داخل کیا۔ ایک روز محمد علی بادشاہ نے ان سے ارشاد فرمایا کہ مجھ کو فوج کی کمی کرنا منظور ہے، جو لوگ ضعیف ہیں ان کو موقوف کرو۔ چار لاکھ روپیا مجھے درکار ہے۔ نواب صاحب نے تجویز کیا، جس قدر رسالے میں گھوڑے بادشاہی ہیں اور بال گیر]بارگیر[[۳۹] ان پر دس دس روپیا کے ملازم ہیں؛ جب کل سواروں کا حساب کیا تو فی] کس؟[۴۰۴ روپیا کی ماہواری سرکار کو دینا پڑتی ہے۔ نواب صاحب ممدوح نے سواروں کو بلا کر ارشاد فرمایا کہ اگر تمھیں خود اس پر ہونا منظور ہو تو بیس روپیا کی ماہواری سرکار سے ملے گی اور فی گھوڑا چار سو روپیا تنخواہ میں دینا پڑے گا۔ جب تک بادشاہ کا روپیا ادا نہ ہوگا، یہی دس روپیا کی ماہواری ملے گی۔ سب سواروں نے منظور کیا اور خوش ہو کر فرد مہر کر دی۔ نواب صاحب نے وہ فرد بادشاہ کے ملاحظے میں گذران دی۔ پانچ لاکھ روپیا کی بادشاہ کو جائیداد نکال دی۔ بادشاہ نے خوش ہو کر خلعت عنایت فرمایا۔ حکم دیا، محمد علی بادشاہ نے، حسین آباد میں جو چیز خریدی جائے، فی روپیا ان کو آدھ آنہ ملے؛ جب تک ہمارا وثیقہ حسین آباد میں قائم رہے۔ جب محمد علی بادشاہ] نے[عارضہ اسحال]اسہال[درد] سے[انتقال کیا، اسی صورت پر نواب کو آدھ آنہ ملتا تھا۔ کئی ہزار روپیا کا سال تھا۔ یہ خانہ نشیں ہو کر اپنے مکان میں بیٹھ رہے[۴۰] مگر دو چار روپے کی روز خیرات کرتے تھے۔ پہلے انگریزی[۴۱] تک ملتا تھا۔

جب فوج انگریزی بگڑ گئی[۴۲] لکھنؤ میں آئی اور تمام امیروں کا[کو] لوٹا۔ بعد ایک روز کے عرصے میں شیخ برکات]؟[احمد رسال دار نے دیکھا کہ فوج تمام شہر کو لوٹ لے گئی، نہایت بدنامی حاصل ہوگی۔ یہ لوٹ کا روپیا کب تک وفا کرے گا؟ اس سے تو یہ بات بہتر ہے کوئی واجد علی بادشاہ کا بیٹا ہو، اس کو گدی پر بٹھا دیں اور ہم سب اس کی تابع داری کریں گے۔ حاکم کی فوج کا کام نہیں ہوتا ہے۔ یہ بات دل میں سوچ کر تلاش کیا تو کوئی] کسی[شخص نے یہ کہا محمد علی بادشاہ کے لڑکے ہیں ان میں سے کسی کو تخت نشین کر دیجیے گا، شیخ صاحب نے دریافت کیا کہ کوئی اولاد واجد علی بادشاہ کی یہاں ہے، لوگوں نے کہا کہ نواب حضرت محل صاحبہ سے ایک لڑکا ہے، اس کا نام برجیس قدر بہادر ہے، یہ سن کے شیخ برکات

احمد نواب حضرت محل صاحبہ کی ڈیوڑھی پر تشریف لائے اور بیگم صاحبہ سے کہا کہ شہزادے کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ان کو تخت بادشاہی] پر[بٹھانا فوج بہادر کو منظور ہے۔بیگم صاحبہ نے انکار کیا کہ نہ میرے پاس روپیا ہے نہ وہ سلطنت ہے،تنخواہ ہم تم کو کہاں سے لاکر دیں گے اور ہزار ہا روپیا کا توپ گولہ اور بارود کا خرچ ہے، یہ کہاں سے آئے گا؟ رسال دار صاحب نے عرض کیا، ہمارے پاس خزانہ موجود ہے، ہم کو تنخواہ سے کچھ غرض نہیں ہے۔جب حضور کی خوب عمل داری ہو جاوے گی،اس وقت تنخواہ ہم آپ سے لیں گے۔زبردستی محل دار سے بلا کر برجیس قدر کو نہلا دھلا کے جلدی سے تخت پر بٹھا دیا۔سلامی کی توپ چلنے لگی۔رعیت تمام سن کے خوش ہوئی اور صبح سے فوج کی بھرتی ہونے لگی اور توپ بننے لگی اور ٹکسال جاری ہوئی۔ تجویز فوج کی یہ ہوئی کہ جس قدر پرانے کارندے موجود ہیں،ان کو بلا کر وہی کام ان کے حوالے کیا جائے۔سب لوگ حکم سلطانی سن کے در دولت پر حاضر ہوئے اور اپنے اپنے کام پر مقرر ہوئے لیکن نواب شرف الدولہ بہادر سے فوج انگریزی نے نہایت ظلم کیا۔ان کو وزارت کا خلعت دیا، کام سرکار کا کرنے لگے۔اپنے ملک کے راجگان کو طلب کیا اور حکم دیا کہ بہت ہوشیاری سے کام کرو۔جس وقت لڑائی فتح ہو جاوے گی،اس وقت تم کو سرکار سے انعام ملے گا اور جاگیر پاؤ گے۔سب راجا کام دل لگا کر کرنے لگے۔فوج علاقے پر روانہ کر دی گئی۔چند لوگ حاضر حضور میں رہ گئے۔اس وقت انگریزی فوج نے دھاوا کر کے دو روز میں اپنا عمل شہر میں کر لیا اور خلقت تمام اپنا مکان چھوڑ کر جس طرف جس کا جی چاہا، وہاں چلا گیا۔بیگم صاحبہ قیصر باغ سے نواب شرف الدولہ بہادر کے مکان پر پانچ پہر رہیں،آخر وہاں سے طرف خیر آباد کے تشریف لے گئیں۔نواب صاحب نے اپنے لڑکے خیر آباد کے مکان میں پہلے سے روانہ کر دیے تھے۔تنہا مکان میں آپ تھے اور گورے جب سر پر آ کے موجود ہوئے اور ان کے جس قدر سپاہی تھے وہ سب بھاگ گئے۔شب کے نو بجے نواب صاحب اپنے مکان سے نکلے۔دو خدمت گار ساتھ تھے،ان کے پاس صندوقچہ تھا۔ڈاڑھی کترواڈالی تھی۔دو سوار ان کو راہ میں ملے۔ہمراہی احمد اللہ شاہ کے ساتھ تھے۔انھوں نے نواب مذکور] کو[پہچانا اور جلدی سے پکڑ لیا۔خدمت گار چلے گئے۔ نواب صاحب نے کہا ان سے کہ ہم کو چھوڑ دو۔یہ جواہرات کے صندوق تم لے لو۔سواروں نے کہا کہ تم کو شاہ جی صاحب کے پاس لے جائیں گے۔آخر ان کو شاہ صاحب کے پاس لے گئے۔نواب صاحب چار لاکھ روپیا احمد اللہ شاہ کو دیتے تھے مگر اس شخص کے دل میں کچھ نہ رحم آیا۔نواب کو مار کے توپ دروازے کی بدرو میں ڈال دیا۔نہ گور ہی ہوئی نہ کفن ملا۔کتے لاش کو کھا گئے۔نام کو ایک استخوان بھی نہ ملا۔شعرا چھا کہتے تھے۔مضامین نہایت عمدہ ہوتے تھے درد کے۔ان کی یادگار یہ کلام موجود ہے؛ایک دیوان،ایک مثنوی،ایک واسوخت۔

۔۔۔۔فقط۔۔۔۔

اسحاق

تخلص اسحاق،نواب اسحاق علی خان مرحوم ولد نواب فدا علی خان مرحوم،شاگرد نواب عاشور علی خان مرحوم۔یہ سب

صاحب، اولاد نواب سالار جنگ بہادر کی ہیں۔ بڑے عالی خاندان ہیں اور ایک صفت یہ ہے کہ گانے بجانے کا ہر ایک کو نہایت شوق ہے اور سوز خوانی بھی کرتے ہیں۔ نواب صاحب مرحوم کو پچاس برس کی عمر میں چار شوق ہوئے ایک تو بٹیر لڑانے کا، ایک روپیا سے سو روپیا تک لڑاتے تھے۔ اکثر ان کے مکان میں ہر ہفتے میں پالی ہوتی [۴۳] تھی۔ دوسرا شوق انڈے لڑانے [۴۴] کا ہوا۔ صدہا سبز وار [۴۵] مرغیاں پالی تھیں۔ پانچ روپے تک انڈے لڑاتے تھے اور نوروز کے دن پانچ پانچ ہزار انڈوں کی قطار لڑاتے تھے اور ہر طرح کے رنگے جاتے تھے۔ تیسرا شوق پتنگ لڑانے کا ہوا تو پتنگ باز نوکر ہوئے، دس روپیا ماہواری کے۔ ہر ہفتے میں میدان کرتا [۴۶] تھا۔ صبح سے شام تک سو روپے کا میدان ہوا خواہ دو سو روپے کا ہوا۔ چوتھا شوق یہ ہوا کہ پندرہ برس کے سن میں شعر و سخن کے سوائے اس چرچے کے] کذا[اور شغل ان کی صحبت میں نہیں ہوتا تھا اور مشاعرے بھی نہایت دھوم سے ان کے مکان میں ہوئے۔ آج تک اکثر لوگ اس صحبت کو یاد کرتے ہیں اور جان صاحب ریختی گو ان کے ساتھ اکثر مشاعرے میں جاتے تھے۔ کسی وقت اِن کا، اُن کا ساتھ نہ چھوٹتا تھا۔ سکونت لکھنؤ میں، حویلی ان کی محلہ مالی خان کی سرائے میں تھی۔ متصل مکان شاہ بہاری لال مہاجن، قرب] قریب[بازار الماس علی خان کے۔ بعد غدر کے وہ مکانات مسمار ہو گئے۔ یہ اہل وصایق]وثایق[شہر میں جا بجا مشہور و معروف ہیں۔ نہایت اچھا شعر کہتے تھے۔ راقم سے ملاقات تھی۔ جوان صالح تھے۔ نہایت خوش غذا اور خوش اوقات تھے۔ عارضہ بخار میں انتقال کیا ۱۲۸۵ ہجری میں۔ اپنے مکان میں دفن ہیں۔ صاحب اولاد ہیں۔ آدمی نیک تھے۔ ان کی یادگار میں سے یہ کلام موجود ہے۔ دو دیوان، تین واسوخت، ایک مثنوی، ترجیع بند، تاریخ، رباعی، سلام، پچاس مخمس، نوحہ، گرہ بند مسدس۔ شعر

بلبل کہاں سے کوئی تجھے لا دکھائے گل گلشن میں خاک اڑاتی ہے اب تو بجائے گل
دیکھے خزاں میں گل کو زمیں پر اگر پڑا آنکھوں سے اپنی بلبلِ شیدا اٹھائے گل

۔۔۔۔فقط۔۔۔۔

رنگین

تخلص رنگین، مرزا سعادت یار خان مرحوم ریختی گو، ولد مرزا طمانیت بیگ خان، خطابِ سلطانی محکم الدولہ بہادر مرحوم، شاگرد شاہ حاتم مرحوم] دہلی کے معروف استاد شاعر ۱۷۰۰۔۱۶۹۹ تا ۲۔]۱۷۹۱۔ فن سپاہ گری میں] کذا[اچھی طرح سے جانتے تھے۔ باشندہ تورانی تھے، بہت سے شہروں کی سیر کی تھی۔ سات برس کے سن میں روم سے ہندوستان میں آئے تھے۔ منصب ان کو ہفت ہزاری کا حاصل تھا۔ سرحد ہندوستان میں پیدا ہوئے تھے اور گاہ گاہے اطراف ہندوستان میں سیر کرتے تھے مگر بہت عرصہ تک شاہ جہاں آباد میں بسر اوقات کی تھی۔ ابتدائی عمر میں شاہ حاتم سے تربیت پائی اور فن شاعری بھی ان کی خدمت میں حاصل کیا تھا۔ جب شاہ حاتم کی وفات ہوئی، بعد ان کے پھر کسی شخص سے اپنی غزل یا ریختی پر اصلاح نہیں لی، اپنے اور طبع کے اعتماد پر اپنے سخن پر خود اصلاح دیتے تھے۔ برائے سیر کلکتہ میں بھی آئے تھے۔ ریختی کے یہ موجود

]موجد[ہیں، صاحب تذکرہ گلستان سخن نے جو میر انشا اللہ خان مرحوم کو فن ریختی کا موجد قیاس کیا ہے، بلکہ خود میر انشا اللہ خان نے نسخہ دریائے لطافت میں لکھا ہے، کہ یہ اس صاحب تذکرہ نے خطا کی ہے۔ بلکہ اس زبان کو میر انشا اللہ خان نے سعادت یار خان رنگیں سے حاصل کیا تھا[۴۷]۔ ریختہ، ہزل بھی خوب کہتے تھے۔ بیگمات میں پرورش پائی تھی۔ زبان سے بھی خوب آگاہ تھے۔ زبان نہایت صاف تھی۔ جس کو جب جو بات بولنا چاہیے تھی، اس بات کو اس مقام پر بولتے تھے۔ آدمی نہایت ذی علم تھے۔ علم عربی اور فارسی خوب جانتے تھے۔ غزل گوئی میں بھی استاد تھے اور بہت امیر کبیر تھے۔ شاہ جہاں آباد میں ان کے مکانات نہایت عمدہ بنے تھے اور باغ ایک برائے سیر بہت خوب نہایت] کذا[تیار کیا تھا۔ شعرا اس باغ میں یہ جا کر موزوں کیا کرتے تھے۔ ان کے مقابلے میں اس شہر میں آدمی کم تھا۔ ان کے شاگرد بھی بہت سے آدمی تھے۔ مشاعرہ ان کے مکان میں بہت بڑا ہوتا تھا۔ تمام رات شعرا کی صحبت رہتی تھی۔ دن کے آٹھ بجے برخاست ہوتی تھی۔ اکثر بیگمات ان کو محل میں بلاتی تھیں اور ان کا کلام سن کے اور ریختی کی ترکیب پڑھنے کی دیکھ کے نہایت دل میں خوش ہوتی تھیں اور جس وقت یہ مشاعرے میں اپنی ریختی پڑھتے تھے، ہنستے ہنستے لوگ بے دم ہو جاتے تھے۔ جو لطف مشاعرے میں ان سے حاصل ہوتا تھا وہ کسی غزل گو سے نہ حاصل ہوتا تھا بلکہ صدہا آدمی ان کی ریختی سننے کے واسطے ہزار کام چھوڑ کے تشریف لاتے تھے۔ جوان نہایت خوب صورت تھے اور خوش پوشاک بھی تھے۔ فیاض نہایت تھے۔ خلیق بہت بڑے تھے۔ ہر ایک شخص سے جھک کے ملتے تھے۔ غرور مزاج میں نام کو نہیں تھا۔ اگر زمانہ ہزار برس چرخ مارے تو ایسے آدمی اب نہیں پیدا ہوں گے۔ جس قدر ریختی گو گزرے ہیں اور جس قدر موجود ہیں، سب نے ان کا کلام دیکھ کے ریختی گوئی کی ہے۔ یہ چوسر خوب کھیلتے تھے۔ ان سے کسی شخص نے بازی کہیں نہیں پائی۔ جو آدمی ان سے کھیلا وہ ہار گیا۔ ان کی چوسر کی تمام شہر میں دھوم تھی بلکہ صدہا آدمی نے ان سے حاصل کی تھی۔ وہ بھی خوب کھیلتے تھے۔ یہ خوش نویس بہت اچھے تھے۔ خط ان کا نہایت پاکیزہ ہوتا تھا اور اس کو دیکھنے سے آنکھوں کو صحت ہوتی تھی۔ اس فن میں بھی ان کے بہت سے لوگ شاگرد تھے اور بعض بعض شاگرد اچھا لکھتے تھے۔ دن کے تین بجے شاگرد اصلاح ان سے آکر لیتے تھے۔ شام تک ان کے مکان پر اس بات کا چرچا رہتا تھا۔ ۱۲۵۱ ہجری میں اس دار فانی سے عارضۂ تپ ولرزہ میں انتقال فرمایا۔ ان کی یادگار میں سے یہ کلام موجود ہیں؛ دو دیوان غزل کے، دو دیوان ریختی کے، ایک دیوان ہزل کا، ایک فرس نامہ، ایک حکایت رنگین اور کئی مثنوی، تاریخ، رباعی، قصیدی[۴۸] و قصیدہ مخمس و خمسہ واسوخت و واسوختی اور کچھ حرزِ زبان بنائیں۔ جوان کی گفتگو ہے، آپس میں عورتیں باتیں کرتی ہیں، وہ اس میں لکھتے ہیں، دو گانا[۴۹] کی اور زَناخی[۵۰] کی اور چوری والی کی اور ڈالی کی کہ او پروالی کی۔

۔۔۔۔فقط۔۔۔۔

مخلوق

تخلص مخلوق، سید احسن[۵۱] ریختی گو مرحوم ولد میر حسن مرحوم، شاگرد ان کے خلف، ساکن لکھنؤ۔ میاں مخلوق کے بزرگ

طلبِ بادشاہ سے دہلی میں اپنا وطن اصل چھوڑ کے ولایتِ ہرات سے پرانی دہلی میں تشریف لائے تھے۔ بادشاہ نے نہایت ان کی خاطر کی تھی اور مصاحب خاص ہوئے۔ ہر ایک طرح کا بادشاہ کے مزاج میں ان کو دخل تھا۔ جس قدر امیر دہلی میں تھے وہ ان کی نہایت خاطر کرتے تھے اور صد ہا روپے کا ان کے ساتھ سلوک کرتے تھے۔ ہر فن میں نہایت دخل تھا۔ لکھتے خوب تھے۔ خط نہایت پاکیزہ تھا۔ صد ہا آدمی کو بادشاہ کی سرکار میں نوکر رکھوا دیا تھا۔ ہزاروں شریفوں کے ساتھ یہ خود ہر طرح سے پیش آتے تھے۔ میر حسن ولد میر غلام حسین مرحوم؛ میر حسن کی پیدائش اور مولد و مسکن خاص دہلی ہے۔ آٹھ برس کے سن میں یہ پڑھنے مولوی صاحب کے پاس بیٹھے تھے۔ پندرہ برس کے سن میں علم فارسی اور عربی سے پڑھ کر فراغت پائی۔ بیس برس کے سن میں ان کو شعر گوئی کا شوق ہوا تھا۔ پہلے یہ شاگرد میر درد کے ہوئے۔ کچھ دنوں تو اپنا کلام ان کو دکھلایا اور ساتھ اپنے استاد کے مشاعرے میں جاتے تھے اور اپنی غزل کروفر سے پڑھتے تھے۔ بعد بربادی دہلی کے اپنے باپ کے ہمراہ میر حسن فیض آباد میں آئے تھے۔ وہ زمانہ نواب شجاع الدولہ بہادر کا تھا۔ ان کے والد ملازم نواب صاحب مرحوم کے ہو گئے؛ اسی عہدہ پر جوان کے واسطے دہلی میں تھا۔ نواب مذکور نے کچھ زمین ان کو رہنے کے واسطے عنایت فرمائی تھی۔ ایک مکان اور ایک دیوان خانہ بہت بڑا بنوایا تھا، اس میں رہتے تھے۔ جب نواب شجاع الدولہ بہادر نے اس دار فانی سے انتقال کیا اور نواب آصف الدولہ بہادر تخت نشین ہوئے اور میر حسن مصاحب ہوئے، اس زمانے میں میر ضیاء الدین مرحوم اور مرزا رفیع سودا کا زمانہ تھا اور ان کی شاعری کا تمام فیض آباد میں شہرہ تھا۔ میر حسن ان دونوں استادوں سے اپنی غزل پر اصلاح لیتے تھے۔ چند عرصے میں اس فن میں کامل ہو گئے تھے۔ میر حسن کے تین لڑکے پیدا ہوئے تھے، میر مستحسن تخلص خلیق مرثیہ گو، میر شوق اور سید احسن تخلص مخلوق ریختی گو[۵۲] نہایت عالی خاندان تھے۔ اپنے والد کے ساتھ مشاعرے میں جایا کرتے تھے، جب یہ مشاعرے میں ریختی چٹک مٹک کے پڑھتے تھے، ہنستے ہنستے لوگ بے تاب ہو جاتے تھے اور نہایت تعریف ہوتی تھی اور کچھ نقد بھی صاحب مشاعرہ ان کو عنایت فرماتا تھا۔ جب محلات بادشاہ معلّٰی ان کو بلاتی تھیں اور ریختی ان سے سنتی تھیں، نہایت خوش ہوتی تھیں اور بہت سا کچھ زر نقد وہاں سے ملتا تھا۔ سب سرکاروں سے کئی سو روپیا کا] کی] ماہواری حاصل ہوتی تھی اور دوشالہ، رومال کا کچھ حساب نہ تھا۔ جب نواب آصف الدولہ بہادر لکھنؤ میں تشریف لائے تو ان کے ساتھ میر حسن بھی آئے اور ایک مکان لکھنؤ میں محلہ نبیرہ قریب مقبرہ حکیم نواب مہدی علی خان، وزیر نصیر الدین حیدر بادشاہ کے، بنوایا تھا۔ میر حسن نے ایک مثنوی واسطے نواب آصف الدولہ بہادر کے، سخاوت میں اور ملک کی تعریف میں] کذا] قصہ بے نظیر اور بدر منیر کو موزوں کر کے نواب آصف الدولہ بہادر کے پاس لے گئے اور ان کی خدمت میں پڑھا۔ جس وقت وہ مقام آیا کہ

اک دن دوشالہ دیے سات سو

یہ مضمون سن کے نواب صاحب میر حسن سے نہایت ناخوش ہوئے اور قید کیا۔ بعد چند روز کے پھر یاد فرمایا اور بہت

بھاری اس دن خلعت اور نقد روپیا عنایت کیا اور مثنوی کی بہت تعریف فرمائی۔ اس سبب سے بعض بعض لوگ کہتے ہیں کہ مثنوی منحوس ہے [۵۳]۔ میر حسن نے عارضہ اسحال [اسہال] میں غرہ ماہ محرم ۱۲۱۰ ہجری دنیا سے انتقال فرمایا اور لکھنؤ میں عقب باغ نواب قاسم علی خان بہادر مرحوم کے محلہ مفتی گنج میں ایک تکیہ ہے، اس میں دفن ہیں۔ اس عہدہ پر میاں مخلوق مقرر ہوئے اور نواب صاحب کی خدمت میں حاضر رہتے تھے۔ ہر مشاعرے میں تشریف لے جاتے تھے مگر اس فن میں ان کا کوئی آدمی شاگرد نہ ہوا۔ زمانہ نواب سعادت علی خان بہادر کے عارضہ بخار میں اس دار فانی سے گزر گئے۔ ان کی یادگار میں سے یہ کلام موجود ہے؛ ایک دیوان ریختی کا، رباعی، تاریخ، قطعہ۔

۔۔۔۔فقط۔۔۔۔

نسبت

تخلص نسبت، احمد علی مرحوم ریختی گو ولد محمد علی مرحوم، شاگرد خلف، باشندہ لکھنؤ، اصلی وطن ان کے بزرگوں کا دہلی ہے، بادشاہ کی سرکار سے نہایت عمدہ عہدے] پر [تھے۔ ہر ایک طرح کا شوق تھا۔ نہایت ذی علم تھے، فن سپاہ گری خوب جانتے تھے، گھوڑے پر نہایت عمدہ سوار ہوتے تھے، برچھا ہزاروں آدمی کی مثل ہلاتے تھے۔ لکڑی کی کسرت خوب کرتے تھے، اس فن میں ان کو نہایت دخل تھا۔ میاں نسبت کے والد زمانہ نواب آصف الدولہ بہادر کے دہلی سے فیض آباد میں آئے۔ بعد چند روز کے ملازم نواب صاحب کے ہوئے۔ جب نواب صاحب مرحوم لکھنؤ میں تشریف لائے ان کے ساتھ یہ بھی آئے تھے اور ایک مکان لکھنؤ میں اپنی ذات خاص سے نہایت عمدہ بنایا تھا۔ اس میں مع عزیز اور اہل خانہ کے رہتے تھے۔ وہ زمانہ میر محمد تقی مرحوم اور مصحفی، میر حسن کا تھا۔ نسبت شاعر کا مولد و مسکن خاص لکھنؤ ہے۔ نو برس کی عمر میں ان کے باپ نے پڑھنے کو مولوی صاحب کے پاس بٹھلایا تھا۔ اٹھارہ برس کی عمر میں یہ علم فارسی اور علم عربی پڑھ کے فارغ ہوئے۔ ان کے والد بیمار ہوئے، عارضہ اسہال میں اس دار فانی سے انتقال کیا۔ یہ اپنے باپ کی جا پر ملازم سرکار نواب صاحب کے ہوئے۔ ابتدا میں یہ غزل فرماتے تھے، جب دیکھا کہ ان استادوں کے سامنے کوئی شخص ہماری غزل نہ سنائے گا۔ تمام عمر نہ نام ہوگا۔ یہ بات دل میں سمجھ کے ریختی فرمانے لگے اور مشاعروں میں جانے لگے اور مشاعروں کی طرح میں ریختی لکھنے لگے۔ امیر اور غریب، یہ رنگ ہنسنے کا تھا اور دل لگی کا تھا۔ مضمون ہر شعر میں عمدہ تھا۔ نہایت خاص و عام مشاعرے میں سن کے ریختی خوش ہوئے۔ چند روز میں ان کے کلام کا تمام شہر میں شہرہ ہو گیا تھا اور ہر سرکار سے تنخواہ مقرر ہوئی تھی اور الگ محلات معلّٰی سے ان کی طلب ہوتی تھی۔ یہ جس وقت جاتے تھے، ان کی نہایت خاطر ہوتی تھی۔ زر نقد اور خلعت بھی ہوتا تھا۔ ہر روز ان کا اس طور پر کام ہوتا تھا اور جو لکھنؤ میں کوئی رئیس تشریف لاتا تھا، وہ ان کا مشتاق ہوتا تھا اور طلب فرماتا تھا۔ سن کے ان کے اشعار نہایت خوش ہوتا تھا اور ہر طرح کا اس وقت اس کو لطف ان کی زبان سے حاصل ہوتا تھا اور شہر کی جو طوائف تھی، ان کی خاطر کرتی تھی۔ جو ان کے واسطے بات تھی، وہ کسی شاعر کو نہ حاصل تھی۔ یہ ریختی خوب

پڑھتے تھے، طرز ان کا نہایت خوب تھا۔ عورتوں کا لباس پہن کر یہ ریختی مشاعرے میں پڑھتے تھے۔ ان کی یاد میں سے یہ کلام موجود ہے، ایک مثنوی اور ایک دیوان ریختی۔ یہ نہایت پر گو تھے، شعر اچھا کہتے تھے۔ زبان ان کی نہایت صاف تھی۔ اشعار ان کے پاکیزہ ہوتے تھے۔ اکثر فرماتے تھے کہ میاں نسبت کو اس بات کا نہایت رنج ہے کہ کوئی اس فن میں ہمارا شاگرد نہیں ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص ہوتا تو نام اس سے اپنا قائم رہتا۔ اپنی زندگی میں بہت سے آدمی سے اس مضمون کی درخواست کی تھی مگر کسی نے یہ امر منظور نہ کیا اور انکار کیا، ان کا کلام بہت سا گم ہو گیا۔ جو کچھ لوگوں کے پاس تھا وہ رہ گیا۔ یہ بیمار ہوئے۔ بہت ان کے احباب نے دوا کی، مگر کسی دوا سے صحت نہ ہوئی، عارضہ بخار میں انتقال کیا۔ لکھنؤ میں ایک تکیہ بہت بڑا ہے شاہ میر جلیل کا متصل کوٹھی نواب روشن الدولہ بہادر مرحوم کے، اس میں یہ دفن ہیں۔ ان کے مرنے کا صدہا آدمی کو غم ہوا۔ اب تک لوگ ان کو مشاعرے میں یاد فرماتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اپنے کام کا یکتا تھا۔

۔۔۔۔فقط۔۔۔۔

۱

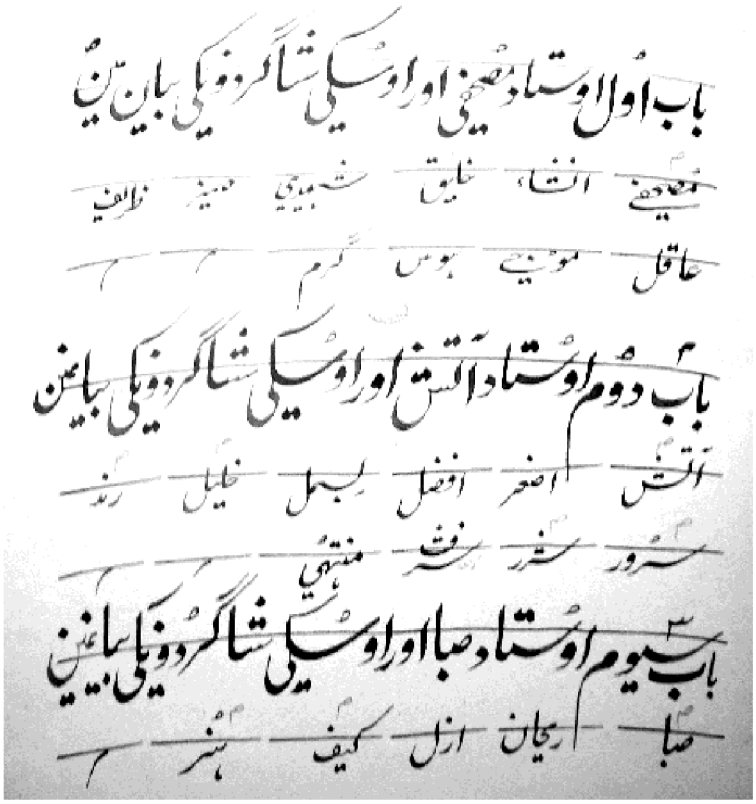

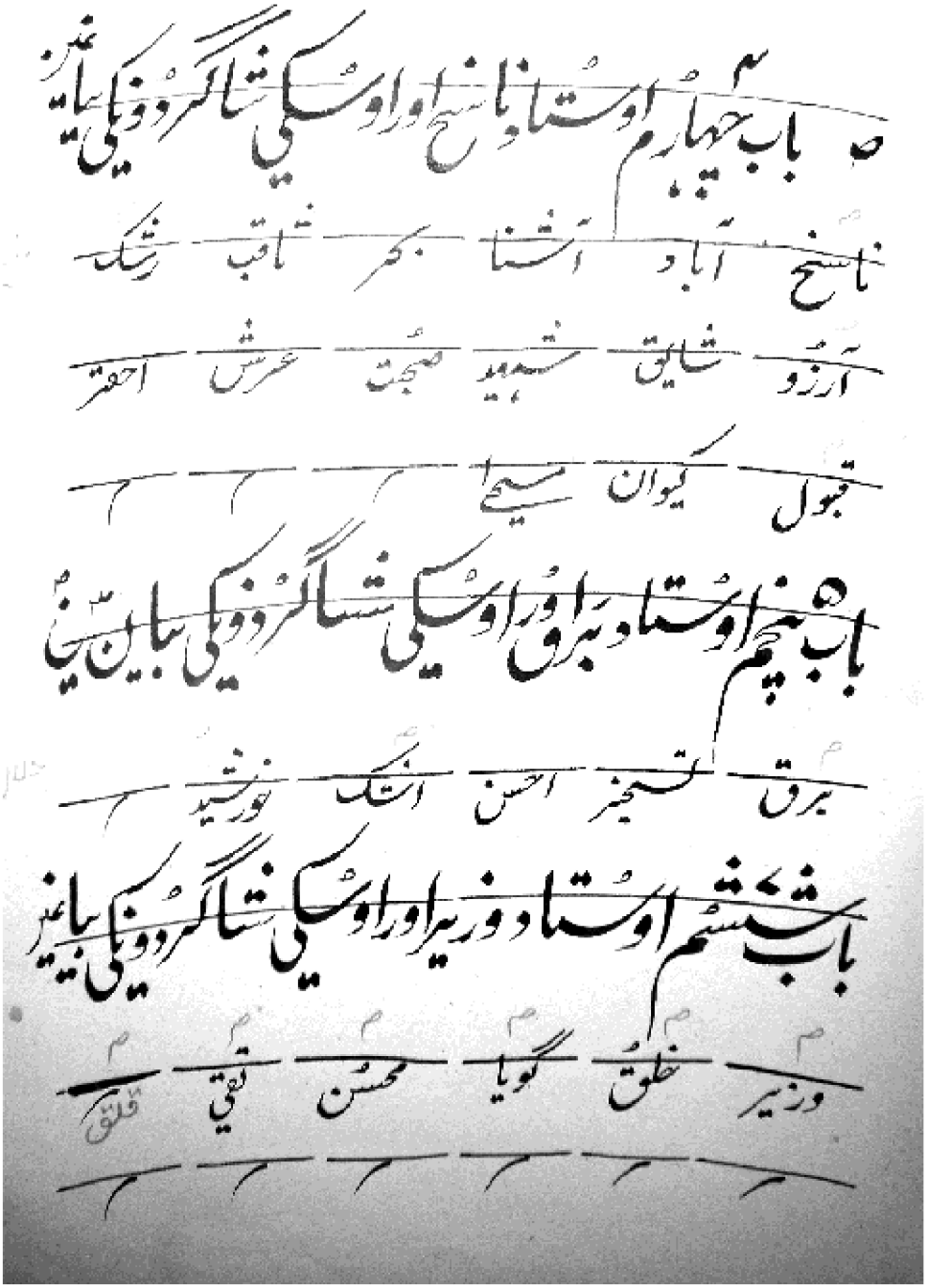
باب چہارم اوستاد ناسخ اور اوسکی شاگردونکی بیان میں
ناسخ آباد آشنا بحر ثاقب رشک
آرزو شایق شہید صحبت عرش احقر
قبول کیوان مسیح
باب پنجم اوستاد برق اور اوسکی شاگردونکی بیان میں
برق تسخیر احسن اشک خورشید
باب ششم اوستاد وزیر اور اوسکی شاگردونکی بیان
وزیر خلق گویا محسن تقی قلق

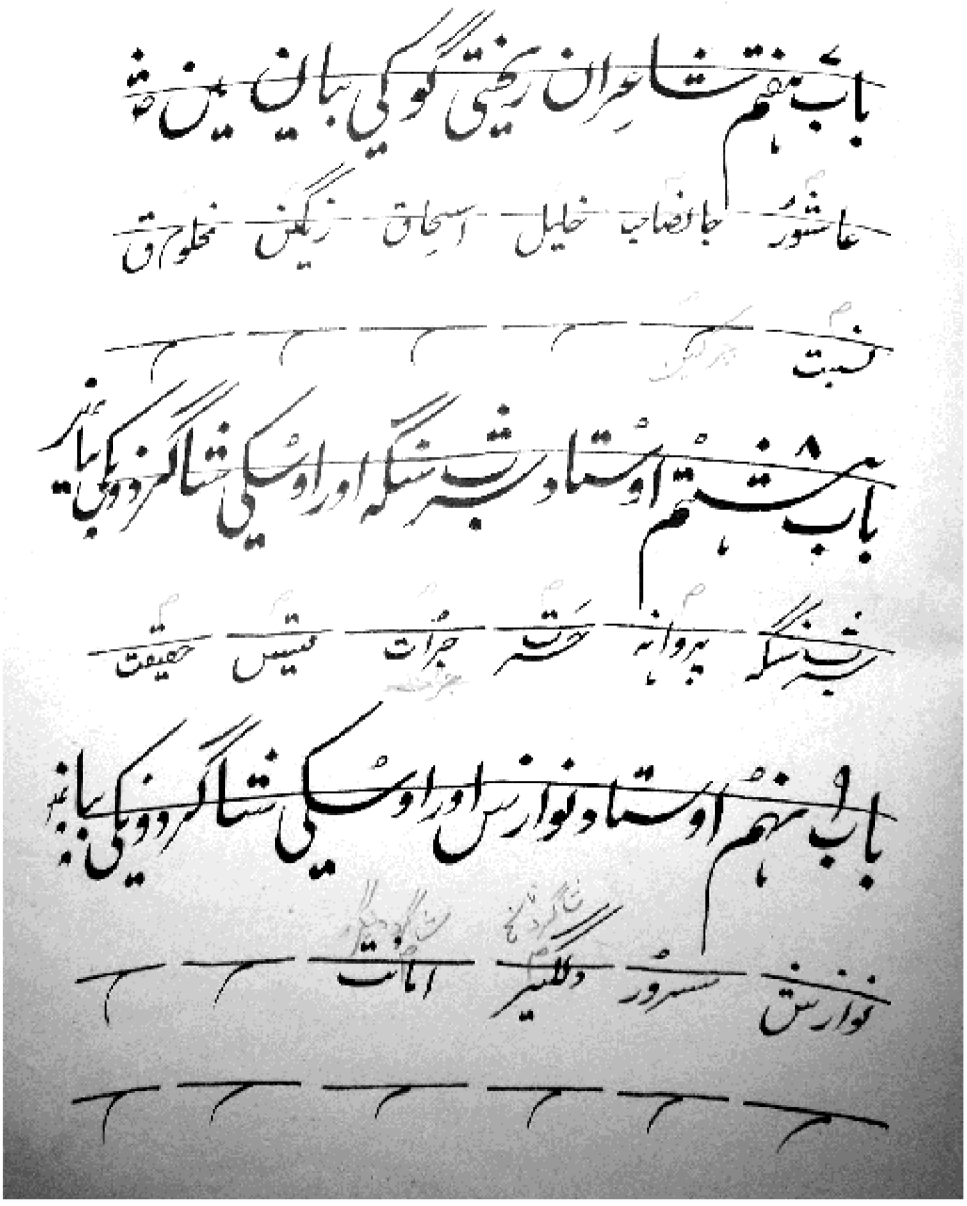

باب ہفتم شاعران ریختی گو کی بیان میں

عاشور — جان صاحب — خلیل — اسحاق — رنگین — مخلوق

نسبت

باب ہشتم اوستاد شبرشگہ اور اوسکی شاگردوں کی بیان میں

شبرشگہ — پروانہ — اختر — جرأت — قیس — حقیقت

باب نہم اوستاد نوازش اور اوسکی شاگردوں کی بیان میں

نوازش — مسرور — دلگیر — امانت

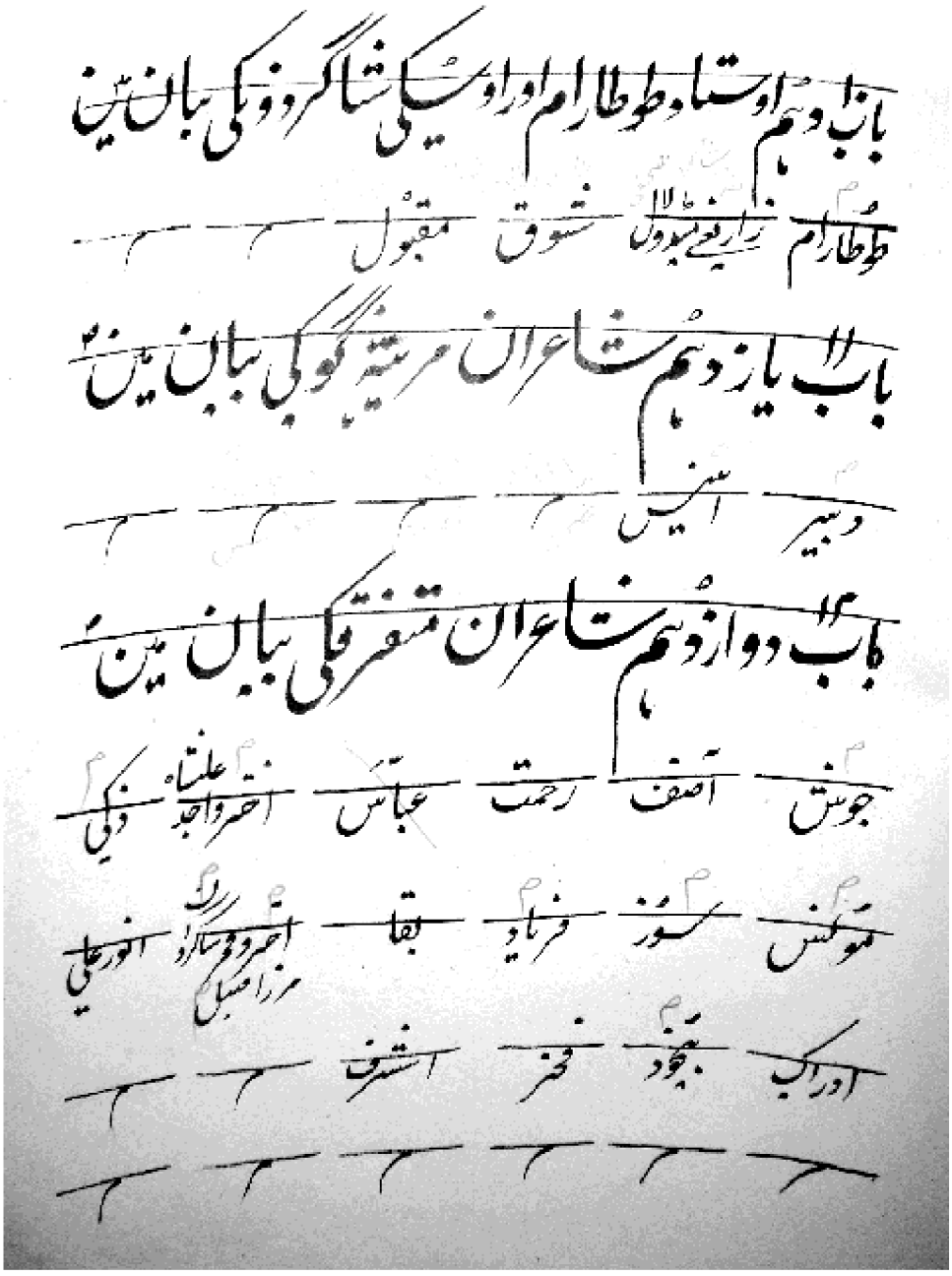

باب دہم استاد طوطا رام اور اوسکی شاگردونکی بیان مین

طوطا رام — مرزا رفیع — شوق — مقبول

باب یازدہم شاعران مرثیہ گوکی بیان مین

دبیر — انیس

باب دوازدہم شاعران متفرق کی بیان مین

جوش — آصف — رحمت — عباس — اختر واجد علی شاہ — ذکی

مونس — سوز — فرہاد — بقا — اختر — انور علی

ادراک — نجود — فخر — اشرف

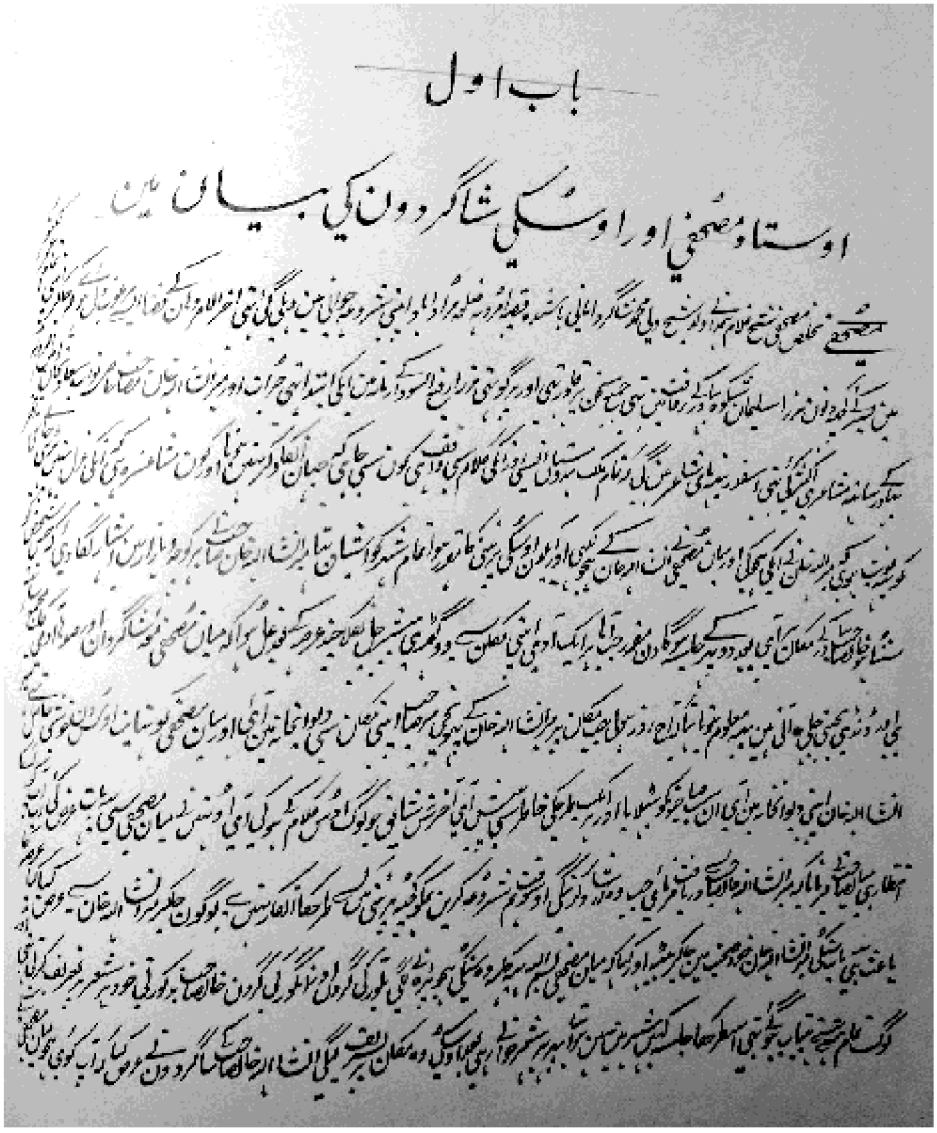

باب اول

اوستاد مصحفی اور اوسکے شاگردوں کے بیان میں

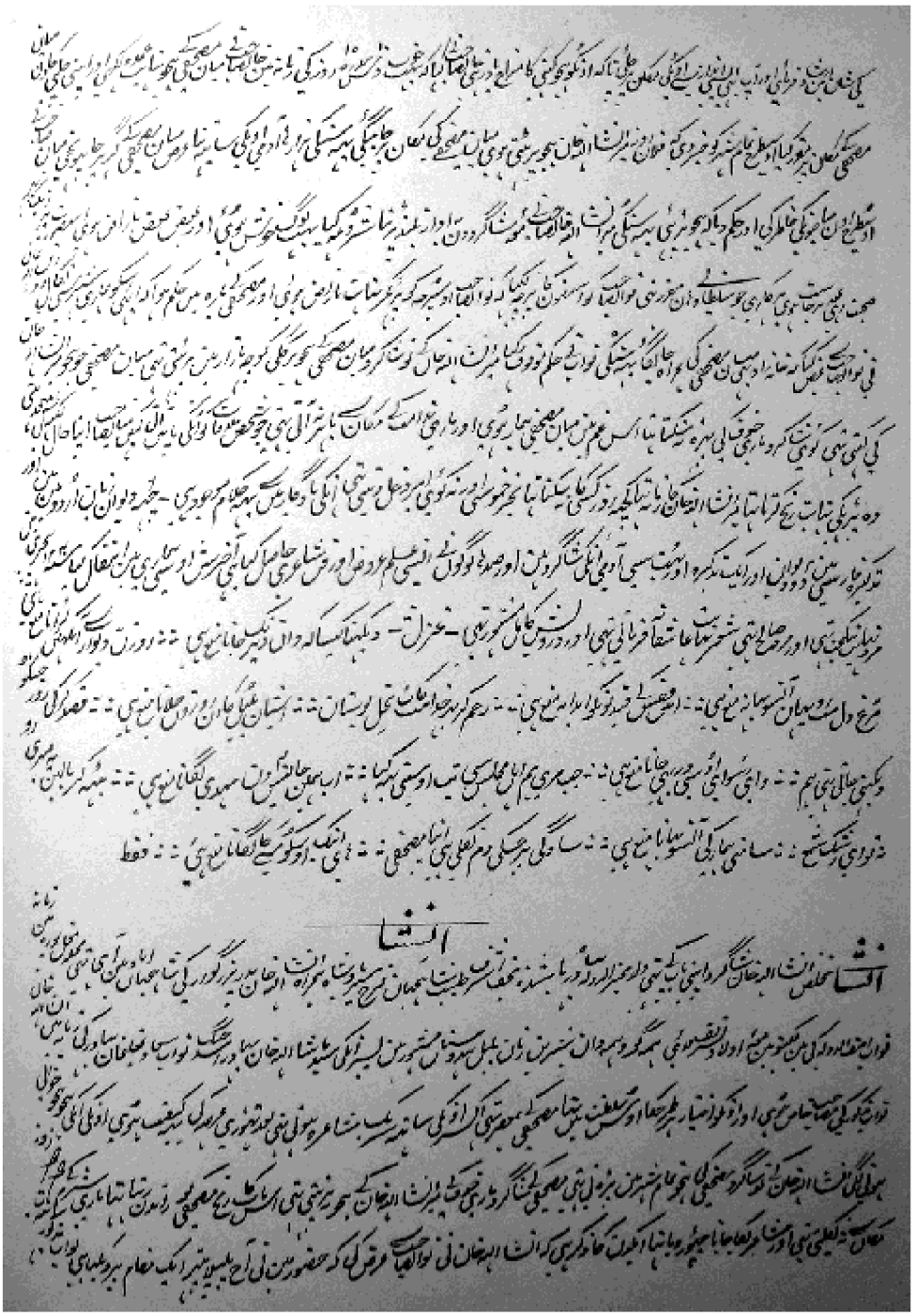

انشا

انشا تخلص انشاء اللہ خان گو دانی پانی پتی ولد میر ماشاء اللہ ساکن پانی پت حسب بیان خود سید ہیں۔ ان کے والد میر ماشاء اللہ خان ہمراہ شاہ عالم ثانی دہلی آئے تھے۔ انشاء اللہ خان بھی بچپن ہی سے شاعری کی طرف مائل تھے۔ ابتدا میں یقین تخلص کرتے تھے۔ بعد میں انشا اختیار کیا۔ ان کے والد کی وفات کے بعد ان کی والدہ نے ان کی تعلیم و تربیت کی۔ انشا نے فارسی کی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ عربی کی تعلیم مولوی سعادت علی سے پائی۔ انشا کی شاعری کا آغاز غزل سے ہوا۔ ابتدا میں مصحفی سے اصلاح لی۔ بعد میں جرأت سے مشورہ سخن کیا۔ انشا کی شاعری میں رنگینی، شوخی اور بانکپن نمایاں ہے۔ ان کی غزل میں عاشقانہ جذبات کی ترجمانی ملتی ہے۔ انشا کی زبان صاف، شستہ اور محاورات سے مزین ہے۔ انشا کی شاعری میں ایہام گوئی کا رجحان بھی ملتا ہے۔ انشا کی شاعری میں ہندی الفاظ کا استعمال بھی ملتا ہے۔ انشا کی شاعری میں ہندی الفاظ کا استعمال بھی ملتا ہے۔ انشا کی شاعری میں ہندی الفاظ کا استعمال بھی ملتا ہے۔

خلیق

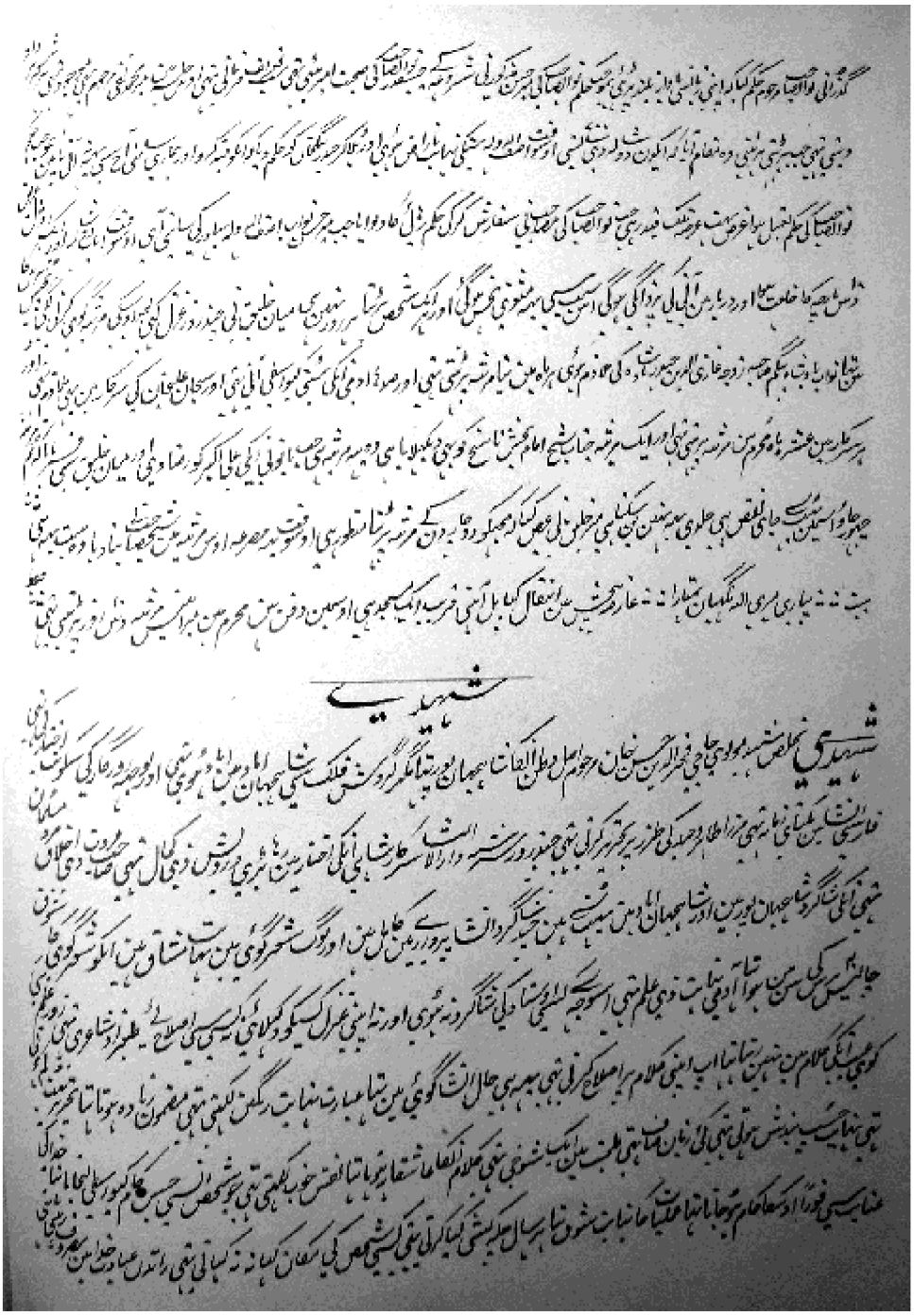

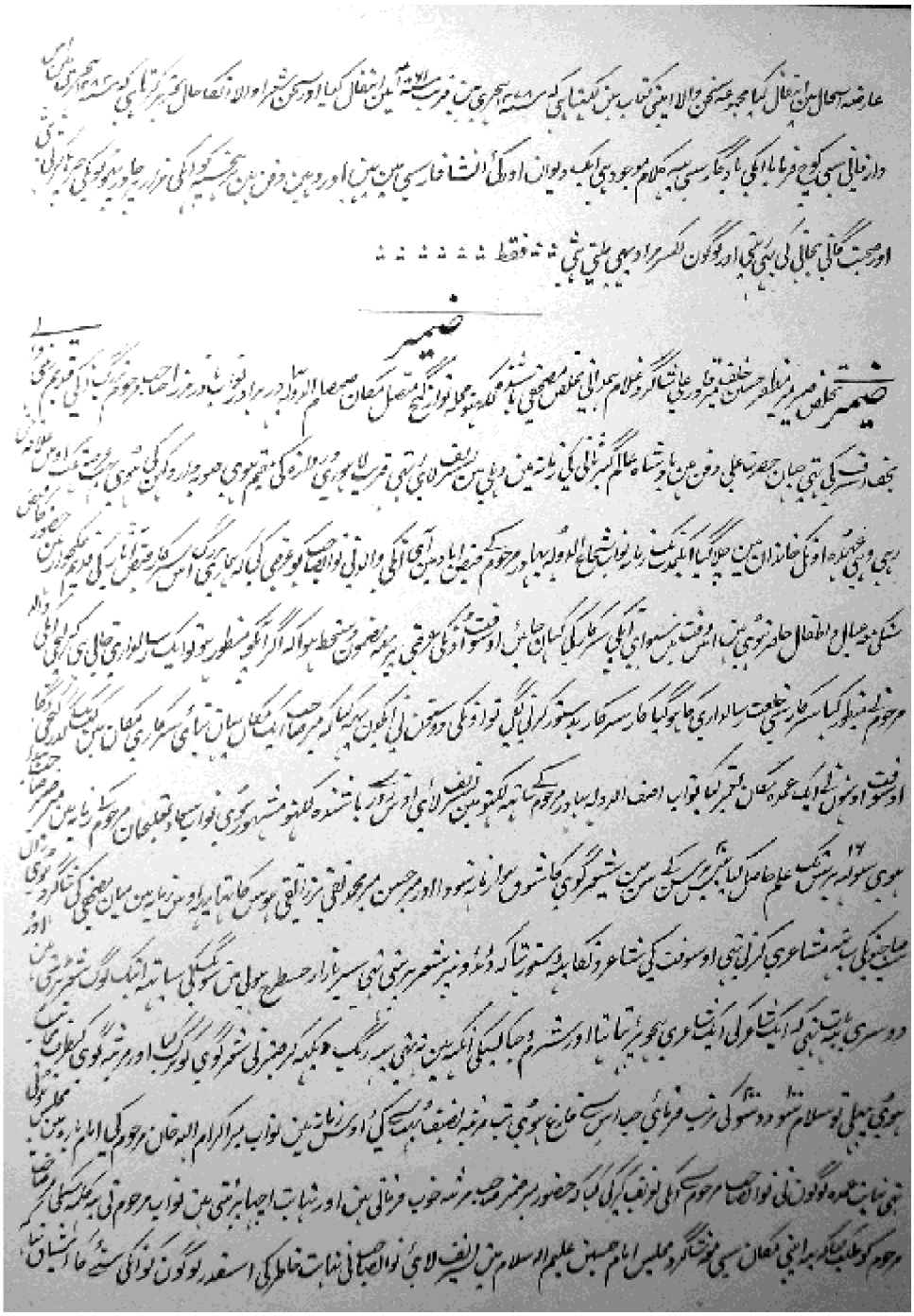

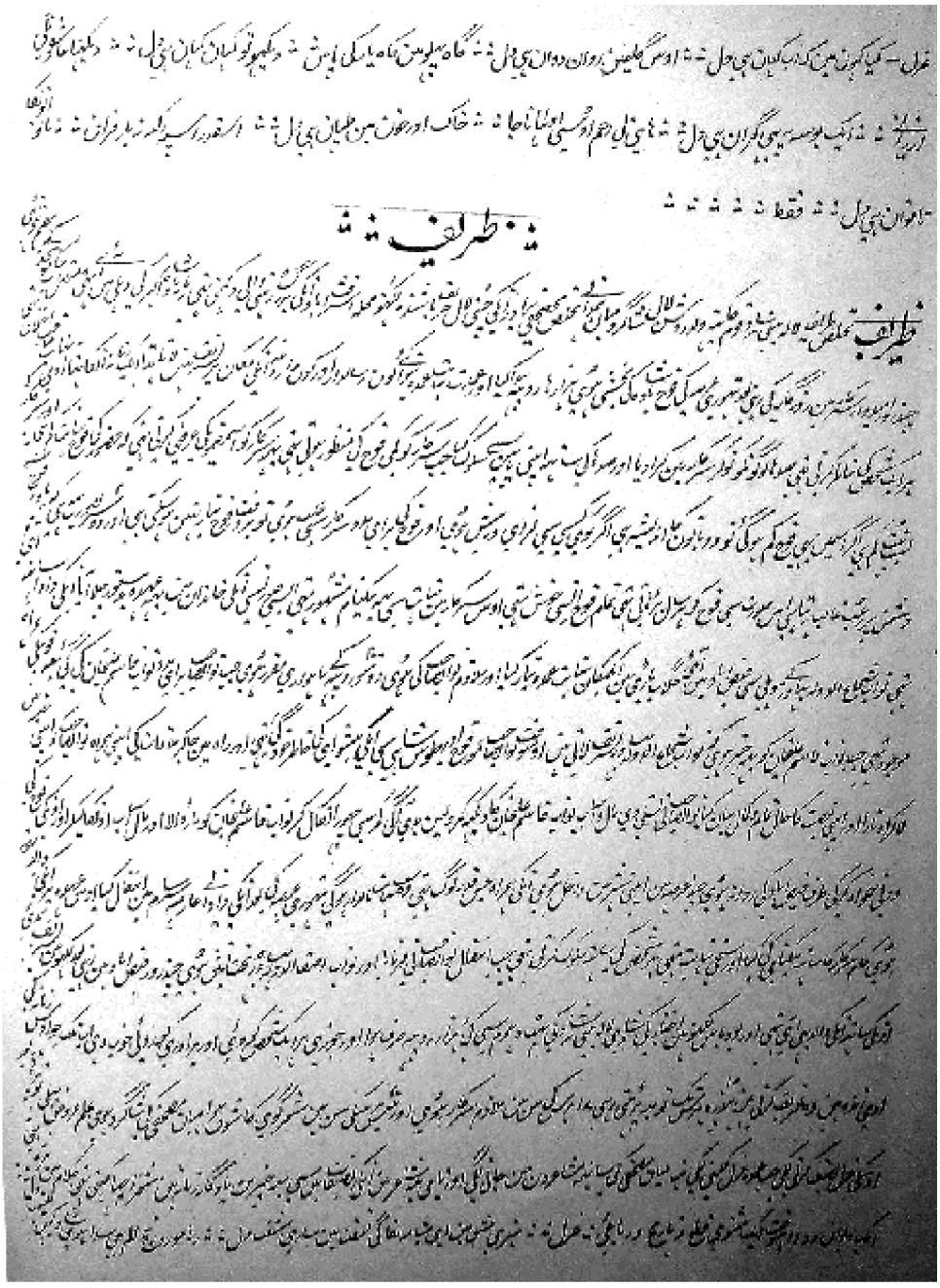

طرائف

عاقل

موجی

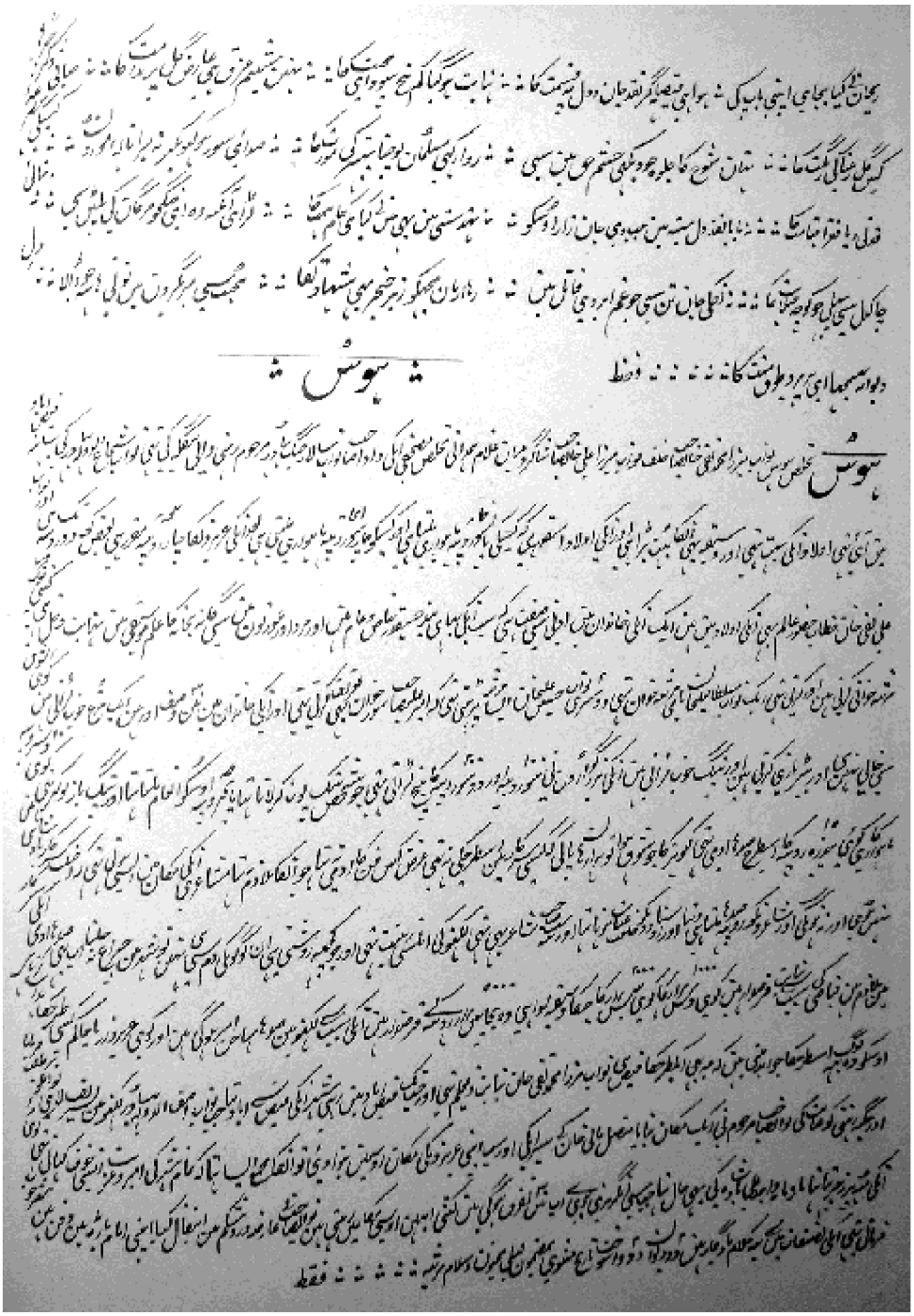

ہوس

ہوس تخلص سرکار نواب مرزا محمد تقی خاں صاحب صفدر مرزا علی خاں صاحب شاگرد میاں غلام حسین تخلص مصحفی کے والد ماجد نواب سالار جنگ بہادر مرحوم رئیس دارالسلطنت حیدرآباد کی اولاد سے ہیں۔ ان کے والد ماجد کی سرکار سے تنخواہ ۔۔۔ ہزار روپیہ سالانہ تھی اور ان کے بھائی اور بیٹے بھی سرکار میں معزز عہدوں پر ممتاز ہیں۔ ان کے بڑے بھائی کی اولاد اکثر ہندوستان میں ہے۔ ان کے ایک بھائی ۔۔۔ میں ۔۔۔ کے ساتھ ۔۔۔ گئے تھے۔ وہیں ان کا انتقال ہوا۔ ان کے ایک بھائی ۔۔۔ میں ۔۔۔ کے ساتھ ۔۔۔ گئے تھے۔ وہیں ان کا انتقال ہوا۔ ان کے ایک بھائی ۔۔۔ میں ۔۔۔ کے ساتھ ۔۔۔ گئے تھے۔ وہیں ان کا انتقال ہوا۔

علی نقی خاں تخلص حضور عالم بھی انہی کی اولاد میں سے ہیں۔ ایک انہی خاندان میں سے امیر تخلص بھی گزرے ہیں۔ ان کے بیٹے بھی شاعر ہیں اور ان کے بھائی بھی شاعر ہیں۔ ان کے بھائی بھی شاعر ہیں۔ ان کے بھائی بھی شاعر ہیں۔

ہوس کی زبان بہت شستہ ہے۔ ان کے کلام میں ۔۔۔ ہے۔ ان کے کلام میں ۔۔۔ ہے۔ ان کے کلام میں ۔۔۔ ہے۔

ہوس کی وفات ۔۔۔ میں ہوئی۔ ان کی وفات ۔۔۔ میں ہوئی۔ ان کی وفات ۔۔۔ میں ہوئی۔

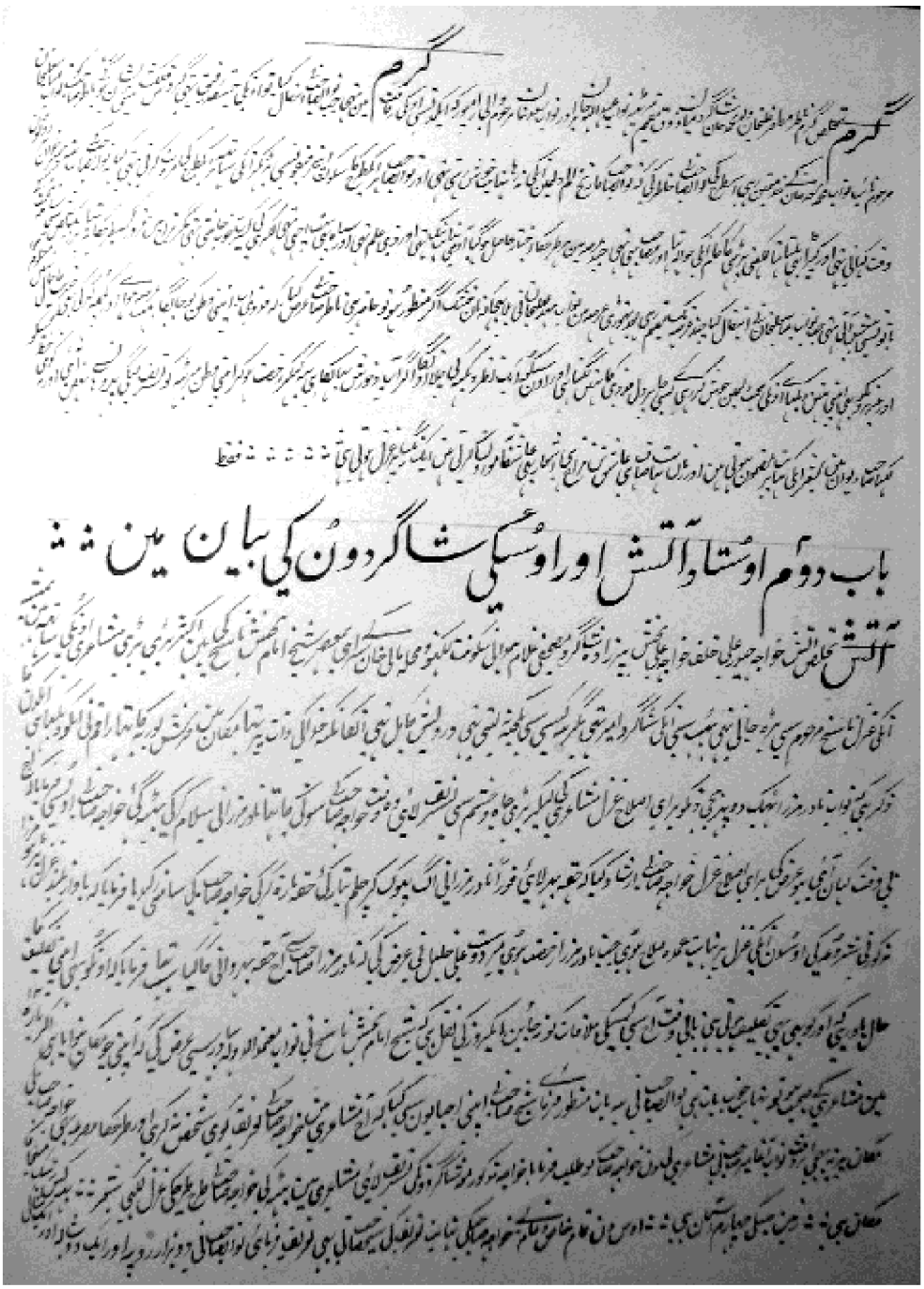

گرم

باب دوئم اوستاد آتش اور اوسکی شاگردون کی بیان مین

حواشی وحوالہ جات:

۱۔ نساخ خود نوشت سوانح حیات، کلکتہ: ایشیاٹک سوسائٹی، س۔ن

۲۔ دفتر بے مثال کلکتہ: مظہر العجائب پریس، ۱۸۶۳ء

۳۔ اشعار نساخ، لکھنؤ: منشی نول کشور پریس، ۱۸۷۴ء

۴۔ ارمغان، کان پور: مطبع نظامی پریس، ۱۸۷۷ء

۵۔ ارمغانی، لکھنؤ: مطبع نامی پریس، ۱۸۸۶ء

۶۔ شاہدِ عشرت، لکھنؤ: منشی نول کشور پریس، ۱۸۷۴،

۷۔ مرغوب دل، لکھنؤ: منشی نول کشور پریس، ۱۸۷۴ء

۸۔ گنج تواریخ، مطبع نامی اودھ اخبار پریس، ۴۔ ۱۸۷۳ء

۹۔ کنز تواریخ، کان پور: مطبع نظامی پریس، ۸۔ ۱۸۷۷ء

۱۰۔ باغ فکر، لکھنؤ: مطبع نامی پریس، ۱۸۸۷،

۱۱۔ ترانہ خامہ، لکھنؤ: مطبع بحر العلوم پریس، ۵۔ ۱۸۸۴ء

۱۲۔ مظہر معما، لکھنؤ: مطبع بحر العلوم پریس، ۵۔ ۱۸۸۴ء

۱۳۔ ان میں مندرجہ ذیل کتب شامل ہیں: نصاب زبان اردو حصہ دوم (حصہ نظم)، کلکتہ کالج پریس، ۱۸۶۳ء؛ منتخبات دواوین شعرائے ہند، کلکتہ کالج پریس، ۱۸۶۴ء؛ سفینۂ منتخب، لکھنؤ: مطبع نامی پریس، ۱۸۸۸ء؛ قصائد منتخبہ، لکھنؤ: مطبع نامی پریس، ۱۸۸۸ء؛ زبان ریختہ، لکھنؤ: مطبع منشی نول کشور، ۱۸۷۴ء؛ نصرۃ المسلمین، دہلی: مطبع حامی الاسلام پریس، ۱۳۰۳ھ؛ چشمہ فیض، کلکتہ: ۱۸۶۳ء

۱۴۔ انتخاب نقص، کان پور: مطبع نظامی پریس، ۵۔ ۱۸۸۴ء

۱۵۔ شبلی نعمانی، موازنۂ انیس و دبیر لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۴ء، ۲۷۳۔۲۷۶

۱۶۔ سخن شعرا، لکھنؤ: منشی نول کشور پریس، ۱۸۷۴ء

۱۷۔ قطعہ منتخب، لکھنؤ: منشی نول کشور پریس، ۱۸۷۴ء

۱۸۔ تذکرۃ المعاصرین، مرتبہ ۱۸۹۱ء، ڈاکٹر محمد صدر الحق نے اپنے مقالے میں لکھا ہے کہ اس تذکرے کا اب تک واحد نسخہ دستیاب ہے جو ڈھاکا یونی ورسٹی میں موجود ہے اور ناقص الاول ہے۔ یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ اس کا نام تذکرۃ المعاصرین ہے۔ البتہ نساخ پر مقالات لکھنے والے مختلف محققین نے اس بات کی تصدیق کی ہے کہ انھوں نے ہندوستان کے فارسی گو معاصر شعرا کا ایک تذکرہ تصنیف کیا تھا جو ان کی وفات کے باعث نامکمل رہ گیا تھا۔ نساخ۔ حیات و تصانیف، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۷۷ء، ص ۲۵۱۔ ۲۵۴

۱۹۔ قند پارسی، لکھنؤ: منشی نول کشور پریس، ۱۸۷۲ء

۲۰۔ گنج تواریخ، ص ۴

۲۱۔ مجموعہ سخن کوئی باقاعدہ تذکرہ نہیں بلکہ ۱۸۷۲ میں نصابی مقاصد کے لیے مرتب کی گئی کتاب کا نام ہے جو دو حصوں پر مشتمل ہے اور پہلی بار مطبع نول کشور لکھنؤ سے شائع ہوئی تھی۔ اس کے بیسیوں ایڈیشن بعد میں بھی طبع ہوتے رہے۔

۲۲۔ متن سے واضح نہیں ہوتا کہ نساخ نے کس بادشاہ کا ذکر کیا ہے۔ اغلب ہے کہ شاہ عالم ثانی (ح۔ ۱۷۵۹ تا ۱۸۰۶) کا ذکر ہوگا۔

۲۳۔ شجاع الدولہ کی اس غیر معمولی قوت اور طاقت کا حال مولانا نجم الغنی خان نے بھی تفصیل سے درج کیا ہے۔ تاریخ اودھ، حصہ دوم، لکھنؤ: مطبع منشی نول کشور، ۱۹۱۹ء، ص ۱۴۔ ۱۵

۲۴۔ اس واقعے کی تصدیق دیگر کتب سے نہیں ہوتی۔

۲۵۔ تاریخ اودھ، حصہ دوم میں درج ہے کہ نواب شجاع الدولہ ران میں نکلنے والے دنبل کے آزار میں مبتلا ہو گئے تھے۔مختلف تواریخ میں اس کے بارے میں طرح طرح کی کہانیاں ملتی ہیں۔ان میں سے ایک کہانی یہ بھی تھی کہ نواب نے حافظ رحمت خان کی دختر کی بے آبروئی کرنے کی کوشش کی تو اس نے زہر آلود نشتر دے مارا جس کا اثر کبھی زائل نہ ہو سکا۔بعض مؤرخ اس عورت کو حافظ رحمت خان کی دختر نہیں بلکہ ایک اورعزیزہ قرار دیتے ہیں۔مگر یہ سب کہانیاں بے سند ہیں۔نساخ نے اس کہانی میں مزید رنگ آمیزی یہ کی ہے کہ اس عورت کی ٹانگیں پھاڑنے اور دو روز بعد نواب کے انتقال کر جانے کے واقعے کا اضافہ کر دیا ہے۔مولانا نجم الغنی کے مطابق شجاع الدولہ کی تاریخ وفات ۲۳ ذی قعد ۱۱۸۸ ہجری، روز پنج شنبہ ہے۔تاریخ اودھ، حصہ دوم، ص ۲۶۲۔۲۶۵، ۲۹۴۔

۲۶۔ عاشور علی خان کے شعر نہ کہنے کے بارے میں نساخ نے سخن شعرا میں بھی لکھا ہے کہ ’’کوئی شعر، سوائے ایک غزل کے جو سراپا سخن میں مندرج ہے، سنا نہیں گیا اور لکھنؤ کے بہت سے شاعروں سے سنا کہ یہ خود شعر کہتے نہ تھے، صرف اپنے شاگردوں کی غزلیں بنا دیتے تھے۔‘‘ (ص ۳۲۰)۔خوش معرکۂ زیبا میں ان کے بارے میں یہ کلمات درج ہیں: ’’نواب عاشور علی خان، خلف الصدق نواب محمد علی خان، ابن وزیر الممالک شجاع الدولہ بہادر، مالک خلق و حلم، صاحب فضل و علم، شاعر سترگ، سخنور بزرگ، ’ذرے اس کی تربیت سے آفتاب‘، پارہ ہائے سنگ (صحبت سراسر افادت سے) لعل مذاب۔ایسا سیر چشم کہ گل دستۂ مضمون اس کی نظر میں دستۂ خار اور گوہر سخن کے جمع کرنے سے خریطۂ بیاض کو ننگ و عار۔غیر صاحبِ دیوان اور سفینۂ خاص سادہ عنوان۔مؤلف کے بجد ہونے سے یہ مخمس منقبت میں تصنیف کیا اور تذکرے میں لکھنے کو دیا۔‘‘ سعادت خان ناصر، تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا، مرتبہ مشفق خواجہ، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۲ء، ۱۱۸۔اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ نساخ کا یہ کہنا درست ہے کہ نواب عاشور علی خان خود اپنے نام سے شعر کہتے تھے نہ مشاعروں میں سنتے تھے البتہ شاگردوں کی غزلیں بنا دیا کرتے تھے تاہم ان کی شاعرانہ قابلیت اور لیاقت کا اعتراف کئی تذکرہ نگاروں نے کیا ہے۔مولوی سید محمد مبین نقوی، تاریخ ریختی، مع دیوان جان صاحب، الہٰ آباد: مطبع انوار احمدی، س۔ن، ص ۳۸۔۳۹۔

۲۷۔ نساخ نے چرکین کو نواب عاشور علی خان کے شاگردوں میں تو شمار کیا ہے مگر ان کا تذکرہ اس باب میں شامل نہیں کیا۔سخن شعرا میں ان کے بارے میں صرف یہ دو جملے ملتے ہیں: ’’چرکین تخلص، شیخ باقر علی، باشندۂ قصبۂ ردولی، غلیظ مضامین میں شعر نہایت پاکیزہ کہتے تھے۔دیوان ان کا نظر سے گزرا۔‘‘ (ص ۱۱۹)۔ناصر نے انھیں پروردۂ خوانِ نعمت نواب عاشور علی خان‘‘ قرار دیا ہے۔(خوش معرکۂ زیبا، جلد دوم، ص ۱۴۱) جامع التذکرہ میں مختلف تذکرہ نگاروں کے حوالے سے ملنے والی معلومات کا حاصل بھی یہی ہے کہ چرکین کے اشعار نہایت فحش اور واہیات ہوتے ہیں۔(انصار اللہ، جامع التذکرہ، جلد سوم، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۲۰۰۷ء، ۲۳۷۔ چرکین کے دیوان کی طباعت پر جان صاحب نے یہ قطعۂ تاریخ کہا تھا:

گل آدم نے ہر اک صفحے کو گلشن بنایا ہے ہوا ہے شہد سے شیریں نئے آئین کا نسخہ
عجیب تاریخ یہ گہیل کہی ہے جان صاحب نے]؟[سنا بی جان باجی، کل چھپا چرکین کا نسخہ ۱۲۷۳ھ

(تاریخ ریختی، مع دیوان جان صاحب، ص ۳۱۸۔) دیوان جان صاحب مع فرہنگ مفیدہ میں تیسرا مصرع یوں درج ہے: عجب تاریخ یہ۔۔۔ہیل کہی ہے جان صاحب نے (ص ۸۴) تاہم دونوں جگہ مصرع نامکمل یا غلط معلوم ہوتا ہے۔

۲۸۔ نساخ کی اس بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب یہ تذکرہ لکھا جا رہا تھا، اس وقت جان صاحب حیات تھے۔مبین نقوی کے مطابق جان صاحب ۱۲۳۴ ہجری (۱۹۔۱۸۱۸) میں فرخ آباد میں پیدا ہوئے (ص ۳۹) آغا حیدر حسن نے بھی یہی تاریخ پیدائش بتائی ہے لیکن تاریخ وفات ۱۳۴۱ھ (۲۳۔۱۹۲۲) بتائی ہے جب کہ یہ بھی لکھا ہے کہ پچاس سال سے زیادہ عمر نہیں پائی تھی۔ان تاریخوں کے اعتبار سے تو عمر سو سال سے بھی زیادہ بنتی ہے۔اغلب ہے کہ سنہ پیدائش یا وفات میں سے کوئی ایک یا شاید دونوں کے اندراج میں سہو ہوا ہے۔(مقدمہ دیوان جان صاحب، مع فرہنگ مفیدہ، مرتبہ نظامی بدایونی (بدایوں، ۱۹۲۳)، ص ۴۰۔۴۱۔نساخ نے ان کا پیشہ لوہاری و نجاری لکھا ہے مگر اس کی تصدیق کسی دوسرے ماخذ سے نہیں ہوئی۔

۲۹۔ نساخ کی یہ بات محل نظر ہے۔ اگر چہ اس تذکرے کی حیثیت ایک معاصر شہادت کے طور پر معتبر سمجھی جانی چاہیے مگر دو باتوں کے سبب اس بات پر یقین متزلزل ہو جاتا ہے، ایک تو یہ کہ کیوں کر ممکن ہے کہ استاد کا تو ایک شعر بھی اس کے نام سے لکھا یا چھپا ہوا نہ ملے اور شاگرد کا پورا دیوان موجود ہو اور وہ مشاعروں میں بھی پڑھتا اور داد و تحسین حاصل کرتا ہو۔ دوسری بات یہ کہ نساخ کا رویہ اس پورے متن کے دوران قدرے سرسری دکھائی دیتا ہے۔ انھوں نے معلومات حاصل کرنے کے لیے زود رس اور سہولت سے ہاتھ آنے والے ماخذات کو ہی کافی جانا ہے اور اس بارے میں زیادہ تحقیق کرنے کی ضرورت محسوس نہیں۔ ان کے نقل کردہ اشعار بھی غالباً ان کے حافظے کا کمال ہیں اور اسی لیے ان میں کئی اغلاط در آئی ہیں۔

۳۰۔ یہ شہر آشوب مخمس کی ہیئت میں لکھا گیا ہے۔ درست مصرع یہ ہے: گور پر حاتم کی روتی ہے سخاوت آج کل۔ دیوان جان صاحب، مع فرہنگ مفیدہ، ص ۶۹

۳۱۔ قلمی نسخے میں اس عبارت کے بعد ایک صفحہ پھٹا ہوا ہے اور ایک صفحہ خالی ہے۔

۳۲۔ نساخ کے اس دعوے کی تصدیق کسی اور ماخذ سے نہیں ہوتی۔ مولوی سید محمد مبین نقوی نے تو تاریخ یختی میں جان صاحب کا شمار اپنے دور کے اہل علم میں کیا ہے اور انھیں عروض کی معلومات سے واقف قرار دیا ہے۔ اس کی مثال کے لیے ایک دو واقعات بھی رقم کیے ہیں۔ (ص ۳۸۔۴۲۔) البتہ انھوں نے امجد علی خان عصمت سے ان کی معاصرانہ چشمک کا حال بھی بیان کیا ہے (ص ۵۰) اور یہ بھی لکھا ہے کہ ایک صاحب میرن نامی نے ایک روز جان صاحب اور عصمت میں دو بدو گفتگو کا موقع پیدا کرنے کی غرض سے مشاعرہ منعقد کیا اور دونوں حضرات کو بلایا مگر جان صاحب ایسے جھگڑوں سے بچنا چاہتے تھے چناں چہ انھوں نے یہ شعر لکھ کر نامی صاحب کو بھیج دیا:

الٹی سیدھی سوت مرزائی سے ہو تقریر نوج میں گر یہاں گیر ہوں یا وہ ہو دامن گیر نوج (ص ۴۳)

۳۳۔ تاریخ اودھ میں بادشاہ کی تاریخ وفات ۴ ربیع الثانی ۱۲۵۳ ہجری بمطابق ۸ جولائی ۱۸۳۷ء درج ہے۔ (حصہ ۴، ص ۳۶۴)۔

۳۴۔ تاریخ اودھ میں اس کا نام دھنیا کہاری لکھا گیا ہے۔ (حصہ ۴، ص ۳۷۱)۔

۳۵۔ نواب روشن الدولہ کا ذکر ہے جو نصیر الدین حیدر کے وزیر تھے۔

۳۶۔ چھوٹے صاحب سے مراد مارٹن صاحب ہیں۔ (تاریخ اودھ، حصہ ۴، ص ۳۷۲)۔

۳۷۔ اگر چہ محمد علی کی تخت نشینی کا قصہ تاریخ کی کتابوں میں بالتفصیل مرقوم ہے لیکن اس میں منشی غلام یحییٰ کے مذکورہ کردار کا تذکرہ نہیں ملتا۔

۳۸۔ شرف الدولہ کے عہدۂ سفارت اور پھر وزارت پر متمکن ہونے کی تصدیق نجم الغنی نے بھی کی ہے؛ تاریخ اودھ، حصہ ۵، ص ۹

۳۹۔ بارگیر اس سائیس یا گھوڑے کی دیکھ بھال کرنے والے ملازم کو کہتے ہیں جس کا ذاتی گھوڑا نہ ہو۔

۴۰۔ نساخ نے تو ان کا اپنے مکان میں بیٹھ رہنا بیان کیا ہے مگر تاریخ اودھ سے معلوم ہوتا ہے کہ شرف الدولہ عہد محمد علی میں عہدۂ وزارت پر فائز تھے، لیکن محمد علی کی وفات کے بعد جب امجد علی شاہ تخت نشیں ہوئے تو وہ شرف الدولہ سے کدورت رکھتے تھے چناں چہ تین ماہ بعد ہی بادشاہ نے انھیں عہدۂ وزارت سے معزول کر دیا؛ تاریخ اودھ، حصہ ۵، ص ۳۳

۴۱۔ بمعنی پنشن جسے انگلیسی بھی کہتے تھے۔

۴۲۔ اس کے بعد نساخ نے جو واقعات درج کیے ہیں وہ غدر کے حالات پر مشتمل ہیں۔ امجد علی شاہ کے بعد واجد علی شاہ تخت نشین ہوئے تھے جن کے عہد میں سقوط اودھ کا واقعہ پیش آیا۔ ان ادوار کے واقعات کو نساخ نے بیان نہیں کیا۔

۴۳۔ پالی ہونا یعنی مقابلہ ہونا، لڑائی ہونا۔

۴۴۔ ایک طرح کی قمار بازی جس میں عموماً عید یا نوروز کے تہواروں پر ایک شخص مٹھی میں انڈہ اس طرح دبا لیتا کہ اس کا سرا باہر رہے۔ دوسرا شخص اپنے ہاتھ کے انڈے سے اس پر چوٹ لگاتا ہے۔ جس کا انڈا ٹوٹ جاتا ہے وہ بازی ہار جاتا ہے۔

۴۵۔ سبز وار مرغی کی ایک خاص قسم ہے جس کے سر پر چوٹی ہوتی ہے۔

۴۶۔ میدان کرنا بمعنی لڑنا، جنگ کرنا، صف آرائی کرنا۔

۴۷۔ نساخ نے گلستان سخن کے مصنف مرزا قادر بخش صابر کی تردید کرتے ہوئے رنگین کو ریختی کا موجد قرار دیا ہے۔ محمد مبین نقوی نے تاریخ ریختی میں اس سے بھی آگے بڑھ کر نہ صرف صابر کی تردید کی ہے بلکہ اس شبے کا اظہار بھی کیا ہے کہ صابر نے تذکرہ گلستان سخن خود نہیں لکھا بلکہ ستر روپے کے عوض شیخ امام بخش صہبائی سے لکھوایا ہے، ص ۱۱

۴۸۔ ''رنگین نے دو صنف سخن ایجاد کیں۔ ایک قصیدہ (قصیدہ کی مؤنث) اور ایک ریختی (ریختہ کی مؤنث)۔ قصیدی نہ چلی، ریختی چل گئی۔'' جمیل جالبی، تاریخ ادب اردو، جلد سوم، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۰۶، ص ۲۹۷

۴۹۔ ہم عمر عورتوں کا ایک رشتہ جو دو مغز بادام کھا کر جوڑا جاتا ہے۔

۵۰۔ بہناپا۔ صاحب فرہنگ آصفیہ کے مطابق بیگمات قلعہ دہلی میں یہ لفظ گہری سہیلی کے لیے بولا جاتا تھا اور زناخی کا رشتے دیگر رشتوں سے زیادہ مضبوط اور قابل قدر گنا جاتا تھا۔ جب کسی کو زناخی بنانا منظور ہوتا تو دونوں عورتیں یا سہیلیاں مل کر زناخ یعنی کبوتر یا مرغ کے سینے کی جڑی ہوئی ہڈی کو توڑا کرتی تھیں۔ وہ لکھتے ہیں، بعض ناواقف لوگ جو کہتے ہیں کہ چپٹ باز عورتوں کا یہ لفظ اور اس کے معنی ہمراز و ہمدم و طبق زن ہیں، یہ محض بہتان ہے۔ ہاں اگر لکھنؤ میں یہ معنی لیے جاتے ہوں تو عجب نہیں۔ (جلد دوم، ص ۴۱۳)۔ اردو لغت (تاریخی اصول پر) میں اسے اوباش عورتوں کی اصطلاح قرار دیا گیا ہے۔ (جلد یازدہم، ص ۱۶۲)۔

۵۱۔ مخلوق کا نام مختلف تذکرہ نگاروں نے مختلف بیان کیا ہے۔ سعادت خان ناصر نے سید احسان علی لکھا ہے (تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا، ص ۴۰۱)، مصحفی نے سید احسان حسن لکھا ہے، تذکرۂ ریاض الفصحا، لکھنؤ: اتر پردیش اردو اکادمی، ۱۹۸۵، ص ۳۲۱، جب کہ نساخ نے سخن شعرا میں مخلوق کا تذکرہ ہی نہیں کیا۔ اغلب ہے کہ مخلوق کا نام احسان ہوگا کیوں کہ رشید حسن خان نے سحر البیان کے پیش لفظ میں میر شیر علی افسوس کے حوالے سے میر حسن کے جن تین بیٹوں کا ذکر کیا ہے ان کے نام میر مستحسن خلیق، میر محسن محسن اور میر احسن خلق ہیں، سحر البیان، نئی دہلی: انجمن ترقی اردو ہند، ۲۰۱۰، ص ۲۱، خود نساخ نے بھی سخن شعرا میں خلق کا نام میر احسن بتایا ہے، ص ۵۰، اگر خلق کا نام بھی احسن تھا تو مخلوق کا نام احسن ہونا قرین قیاس نہیں۔

۵۲۔ نساخ کو یہاں سہو ہوا ہے۔ میر حسن کے چار بیٹے تھے اور ان کے نام وہی تھے جو پہلے درج کیے گئے ہیں۔ ر۔ک۔ حاشیہ ۵۱۔

۵۳۔ یہ قصہ نساخ نے زیر نظر تذکرے کے باب اول میں میر حسن کے بیٹے خلیق کے ذکر میں بھی رقم کیا ہے۔

Abstract

This article aims at introducing almost unheard-of a work, titled, Tazkira-e Shora-e Urdu by Abdul Ghafoor Nassakh, a known literary figure of the late nineteenth Century India, archived in Bodleian library's Indian Institute. The work is all about Rekhti poets. Rekhti is one of the genres of Urdu poetry in the nineteenth century. It is one of the rare works of its kind as its shows much about a poet and the society. The work comprises twelve chapters showing the details of 87 poets. Most of them are the disciples of Ashoor. Highlighting the brief account of Nassakh's works, it presents the seventh chapter of the work in which Nassakh explains theses seven known poets of the time: Ashoor, Jaan sahib, Khalil, Ishaaq, Rangeen, Makhlooq and Nisbat. It highlights that Jaan sahib had a little knowledge of the craft of poetry. He was actually reciting the poetry of his mentor Ashoor as he had a gift of appealing the audience through his style of reading poetry.

Keyword: Rekhti poets of Urdu, Abdul Ghafoor Nassakh, Tazkira-e Shora-e Urdu, Ashoor and his disciples